فہرست

شذرات	فوج کی حکمرانی	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۱۶۸-۱۷۱)	جاوید احمد غامدی	۹
معارفِ نبوی	تقدیر کا اثر	طالب محسن	۱۳
دین و دانش	قانون جہاد (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۱۷
	معرکۂ بدر ــــ ایک خاص معرکہ	محمد بلال	۲۱
نقطۂ نظر	فہم حدیث اور فقہاے امت	محمد عمار خان ناصر	۲۷
	ہیئت نماز کی حفاظت	محمد وسیم اختر مفتی	۴۰
	دستاویزات بحیرۂ مردار (۳)	احسان الرحمٰن غوری	۴۴
حالات و وقائع	جناب پرویز مشرف ــــ حقائق یہ ہیں	محمد اسلم نجمی	۵۳
	مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی (۲)	اختر حسین عزمی	۵۸
وفیات	ایک خورشید جو غروب ہوا	خورشید احمد ندیم	۶۳
	علامہ ابوالخیر اسدی کی رحلت (۲)	محمد بلال	۶۶
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فوج کی حکمرانی

ہمارے سیاسی کلچر میں فوج کی حکمرانی کو اب ایک روایت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ سیاسی جماعتیں باہم برسرِ پیکار ہوتی ہیں؛ سیاست دان ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنے سے انکار کرتے ہیں؛ سول حکومتیں بدانتظامی، عدمِ استحکام اور اخلاقی انحطاط کا بدترین نمونہ پیش کرتی ہیں؛ عوام الناس حکمرانوں کے آگے اپنے مسائل حل نہ ہونے کا رونا روتے ہیں؛ غیر مقبول مذہبی اور سیاسی گروہ فوج کو حکومت سنبھالنے کی پیشکش کرتے ہیں اور فوجی جنرل پوری آمادگیِ دل کے ساتھ اس صدائے خوش نوا پر لبیک کہتے اور قوم کے مسیحا کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ آئین کو بالائے طاق رکھ کر مسندِ اقتدار پر فائز ہوتے ہیں، اقتدار کے زیادہ سے زیادہ مظاہر کو اپنی ذات میں مرتکز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ استحکام حاصل کر لینے کے بعد اپنے اقتدار کے آئینی جواز کے لیے سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں، اقتدار کو طول دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور بالآخر عوام کی ناپسندیدگی کا داغ اپنے دامن پر سجا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

اس روایت کا آغاز اکتوبر ۱۹۵۸ میں جنرل ایوب خان صاحب کے مارشل لا سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سکندر مرزا نے سیاست دانوں کے پرزور ایما پر مارچ ۱۹۵۹ میں عام انتخابات کے انعقاد کا وعدہ کر رکھا تھا۔ سیاسی سرگرمیاں زور پکڑ رہی تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اب سکندر مرزا کے لیے انتخابات سے گریز ممکن نہیں ہو گا اور انتخابات کے نتیجے میں اسے لازماً کرسیِ صدارت سے محروم ہونا پڑے گا۔ محرومی کے اس خدشے کے پیشِ نظر اس نے جنرل ایوب خان کے ذریعے سے مارشل لا نافذ کر دیا۔ جنرل صاحب نے اقتدار میں آنے کے بعد سیاسی اعتبار سے تین بڑے اقدامات کیے:

۱۔ انھوں نے سکندر مرزا کو منصبِ صدارت سے اتارا اور خود اس پر فائز ہو گئے۔

۲۔ انھوں نے ۱۹۵۶ء کے آئین کو منسوخ کیا۔

۳۔ ایک موقع پر سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کی اور سیاست دانوں کو سیاست کے لیے نااہل قرار دیا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ایوب خان ۶۹ء میں رخصت ہو گئے، اس دوران میں انھوں نے جمہوریت کا نعرہ بھی لگایا، انتخابات بھی کرائے اور آئین بھی تشکیل دیا، مگر تاریخ میں وہ ایک آمر اور مخالفِ جمہوریت ہی کی حیثیت سے جانے گئے۔

عوام کی زوردار احتجاجی تحریک کے نتیجے میں ایوب خان کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔ اس موقع پر انھی کے وضع کردہ ۱۹۶۲ء کے آئین کا تقاضا تھا کہ اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کو منتقل کیا جائے، مگر انھوں نے آئین کے علی الرغم عنانِ حکومت چیف آف آرمی اسٹاف جنرل یحییٰ خان کے سپرد کی۔ جنرل یحییٰ خان نے دو سال حکومت کی۔ اس دوران میں ان کے اہم سیاسی اقدام یہ تھے:

۱۔ مارشل لا نافذ کیا۔

۲۔ عوام سے رائے لیے بغیر ون یونٹ کو توڑ دیا۔

۳۔ انتخابات کے بعد اقتدار میں اپنی شرکت کی تگ ودو، منتخب نمائندوں کو انتقالِ اقتدار میں التوا اور مشرقی حصے میں فوجی کارروائی جیسے بعض ایسے معاملات کیے کہ جنھوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کو کامیاب بنانے میں حتمی کردار ادا کیا۔

یحییٰ خان کے بعد کچھ عرصہ تک جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سول حکومت قائم رہی۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزامات کی بنیاد پر بھٹو حکومت کے خلاف ایک زوردار عوامی تحریک شروع ہوئی اور ملک سیاسی خلفشار کا شکار ہو گیا۔ اس صورتِ حال کو بنیاد بنا کر ۱۹۷۸ء میں جنرل ضیاء الحق صاحب نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس موقع پر انھوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ ۹۰ روز کے اندر انتخابات کرا کے رخصت ہو جائیں گے، مگر وہ ۱۰ سال تک حکمرانی کے منصب پر فائز رہے اور فرشتۂ اجل ہی انھیں مسندِ اقتدار سے ہٹانے میں کامیاب ہوا۔ اس دوران میں وہ بتدریج اپنے فوجی تشخص کو کم کرتے چلے گئے اور آہستہ آہستہ جمہوری اداروں کو بھی کسی حد تک بحال کر دیا، مگر اقتدار سے اپنی علیحدگی کو وہ کسی لمحے بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کے اہم سیاسی اقدامات یہ ہیں:

۱۔ آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مارشل لا کا نفاذ۔

۲۔ نام نہاد ریفرنڈم کے ذریعے سے اپنے اقتدار کو آئینی تحفظ دینے کی کوشش۔

۳۔ غیر جماعتی انتخابات کا انعقاد۔

۴۔ گروہی اور فرقہ دارانہ سیاست کا فروغ۔

تاریخی روایت کے اس تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے جنرل پرویز مشرف صاحب نے پاکستان کی عنانِ اقتدار سنبھالی ہے۔ عدالتِ عظمیٰ نے حسبِ سابق انھیں سندِ جواز فراہم کر دی ہے۔ اور اب وہ معطل اسمبلیوں کو تحلیل اور منتخب صدر کو سبک دوش کر کے پاکستان کے صدرِ مملکت کے منصب پر بھی فائز ہو گئے ہیں۔ اہلِ پاکستان اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ ۱۲ اکتوبر کا اقدام دو اداروں کی نہیں، بلکہ دو اداروں کے سربراہوں کی باہمی آویزش کا نتیجہ تھا۔ یہ آویزش اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی، چنانچہ

جناب پرویز مشرف مقررہ مدت تک انتخابات کرا کے رخصت ہو جائیں گے۔ مگر اب ان کی طرف سے اسمبلیوں کی تحلیل اورعہدۂ صدارت کے حصول نے اہلِ پاکستان کو اس شک میں مبتلا کر دیا ہے کہ کیا سابقہ روایت کو ایک مرتبہ پھر دہرایا جائے گا؟ اکتوبر ۲۰۰۲ تک اس سوال کا شافی جواب ملنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔

اس موقع پر، ہم سمجھتے ہیں کہ جناب پرویز مشرف صاحب اور پاکستانی قوم کو ان مسائل سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے جو فوج کے اقتدار پر قابض ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے چند نمایاں مسئلوں کا ذکر کیے دیتے ہیں:

ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں دین کے بعض بنیادی مسلمات مجروح ہوتے ہیں۔

دین کا مسلمہ اصول ہے کہ: '**وامرھم شوریٰ بینھم**'، یعنی ان (مسلمانوں) کا نظام ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہے۔ مسلمان جب بھی کوئی اجتماعی نظام قائم کریں گے، اس کا اصلِ اصول یہی قاعدہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کی سطح پر اجتماعی نوعیت کا کوئی فیصلہ مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر نہیں ہوگا اور اس ضمن میں ان کی رائے کو حتمی حیثیت حاصل ہو گی۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی اس اصول کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی اساس '**امرھم شوریٰ بینھم**' ہے، اس لیے ان کے امرا و حکام کا انتخاب اور حکومت و امارت کا انعقاد مشورے ہی سے ہوگا اور امارت کا منصب سنبھال لینے کے بعد بھی وہ یہ اختیار نہیں رکھتے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد کر دیں۔'' (میزان ۱۱۴)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس اصول کی روشنی میں اگر ہم موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جنرل صاحب کے مختلف اقدامات اس سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتے۔ ۱۲ اکتوبر کے اقدام کو ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس تصور کی بنا پر جائز قرار دے دیں کہ اس کا سبب اولاً قیمتی انسانی جانوں کو زیاں سے بچانا اور ثانیاً ملک کو معاشی تباہی سے محفوظ کرنا تھا۔ یہ خیال اگر حرف بہ حرف بھی صحیح ہو تب بھی حقیقت یہ ہے کہ یہ '**امرھم شوریٰ بینھم**' کے اصول کے منافی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی رائے سے قائم ہونے والی حکومت کو ان سے رائے لیے بغیر ختم کیا گیا ہے۔ حالیہ اقدامات بھی اس اصول کے مطابق درست نہیں ہیں، کیونکہ اسمبلیوں کی تحلیل بھی عوامی رائے کے بغیر ہوئی ہے اور منتخب صدر کی معزولی اور نئے صدر کے تقرر جیسے معاملات بھی عوام الناس کی تائید و تصدیق کے بغیر کیے گئے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات آئین کی خلاف ورزی پر منتج ہوتے ہیں۔ ہمارا آئین درحقیقت وہ دستور العمل ہے جس کے بارے میں قوم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے اجتماعی امور کو اس کی روشنی میں انجام دے گی۔ اس میں ہم نے قومی سطح پر یہ طے کیا ہے کہ ہمارا نظامِ حکومت کیا ہوگا؟ حکومت کس طریقے سے وجود میں آئے گی اور کس طریقے سے اسے تبدیل کیا جا سکے گا؟ سربراہانِ ریاست و حکومت کس طریقے سے منتخب ہوں گے، ان کے کیا اختیارات ہوں گے اور کس طرح ان کا مواخذہ کیا جا سکے گا؟ یہ اور اس نوعیت کے بے شمار امور جزئیات کی حد تک اس دستور میں طے کیے جا چکے ہیں۔ کسی بھی قوم کا سیاسی استحکام اس بات میں مضمر ہوتا ہے کہ آئین کے لفظ لفظ پر پوری دیانت داری سے عمل کیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں

فوج جب بھی اقتدار میں آتی ہے، اس کی خلاف ورزی کر کے ہی آتی ہے۔ چنانچہ جناب مشرف صاحب کے اقدامات کے بارے میں ان سمیت کسی کو یہ تردد نہیں ہوگا کہ وہ آئین کے علی الرغم عمل میں آئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں جمہوری اقدار کی ترویج رک جاتی ہے۔ سیاسی عمل میں رخنہ آ جاتا ہے اور قومی تعمیر و ترقی کا عمل متاثر ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ بات ہر لحاظ سے ثابت شدہ ہے کہ جس معاشرے میں جمہوری اقدار مستحکم ہوں گی، وہ تعمیر و ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری اقدار معاشرے کے افراد کو باشعور بناتی، ان کے اندر اعتماد پیدا کرتی اور انھیں مستقبل کی بہتری کے لیے سرگرمِ عمل کر دیتی ہیں۔ فوجی حکمرانوں کی آمد سے چونکہ قومی معاملات میں ان کی شرکت کا راستہ بند ہو جاتا ہے، اس لیے وہ کوئی فعال کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ مشرف صاحب کے آنے سے پہلے سیاسی عمل اپنی فطری رفتار سے رواں دواں تھا۔ لوگ باری باری مختلف چہروں کو آزما رہے تھے۔ توقع تھی کہ اگر یہ عمل جاری رہا تو آیندہ کچھ عرصے میں نااہل لوگ چھٹتے چلے جائیں گے اور باکردار اور باصلاحیت لوگ قوم کی نمائندگی کے منصب پر فائز ہو جائیں گے، مگر جنرل مشرف صاحب کے اقدامات سے یہ سلسلہ ایک مرتبہ پھر رک گیا ہے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جملۂ معترضہ کے طور پر مختصراً ان اعتراضات کا جائزہ بھی لے لیا جائے جو ہمارے ہاں جمہوریت کے حوالے سے پیش کیے جاتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جمہوریت پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ نظام قرآنِ مجید کے شورائیت کے اصول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے۔ جمہوریت سے مراد وہ نظامِ حکومت و سیاست ہے جس میں فیصلہ کن حیثیت عوام کی رائے کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اصطلاح مغرب کی ایجاد کردہ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے صدیوں پہلے '**امرھم شوریٰ بینھم**' کے لافانی اسلوب میں یہ اصول پوری طرح واضح فرما دیا تھا۔ اس کی روشنی میں ہم بحیثیتِ قوم اپنے حالات اور تمدنی تقاضوں کے پیشِ نظر کوئی بھی نظام اختیار کر سکتے یا وضع کر سکتے ہیں۔ گویا ہم اپنی قومی حیثیت میں مثال کے طور پر یہ طے کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی منتخب کردہ پارلیمان کے ذریعے سے اپنی رائے کو روبہ عمل کریں گے یا اپنے اندر سے کسی فرد کو حکومت چلانے کے لیے براہِ راست منتخب کریں گے یا کسی فوجی جنرل کو اپنے سیاسی معاملات انجام دینے کی ذمہ داری سونپیں گے۔ ۱۹۷۳ء میں ہم نے اپنی قومی حیثیت میں متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ ہم پارلیمانی نظامِ حکومت کے ذریعے سے اپنے ریاستی امور انجام دیں گے۔ ہمارا یہ اقدام '**امرھم شوریٰ بینھم**' کے اصول کے عین مطابق ہے۔

دوسرا اعتراض عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ جمہوری نظامِ حکومت ان ممالک کے لیے ناموزوں ہے جہاں خواندگی کی شرح کم ہو۔ جناب پرویز مشرف صاحب نے بھی منصبِ صدارت پر فائز ہونے سے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک بیان کے ذریعے سے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ:

”پاکستان کا ماحول پارلیمانی جمہوریت کے لیے سازگار نہیں ہے۔ ایک ایسا ملک جس کی چودہ کروڑ آبادی میں سے ستر فی صد لوگ ناخواندہ ہیں، اس سے دنیا کیوں توقع رکھتی ہے کہ وہ مغربی طرز کی جمہوریت کا حامل ہو۔“

(روزنامہ جنگ، ۳ جون ۲۰۰۱)

پارلیمانی جمہوریت سے مراد وہ طرزِ حکومت ہے جس میں پارلیمان کو ریاست کے سب سے برتر ادارے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ادارہ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ عوام کے یہ نمائندے اپنے اندر سے ایک وزیرِ اعظم کا انتخاب کرتے ہیں۔ وزیرِ اعظم اپنی کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا نظم چلاتا ہے۔ وہ اپنے تمام اقدامات کے حوالے سے پارلیمان کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ ارکانِ پارلیمان اگر اس کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہوں تو وہ اسے تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ اس نظام میں صدر کی حیثیت آئینی سربراہ کی ہوتی ہے، نظمِ حکومت اور قانون سازی کے معاملات میں اس کی مداخلت نہایت محدود ہوتی ہے۔

اس نظامِ جمہوریت پر مذکورہ اعتراض کے جواب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ دو باتیں ہی اس کی تردید کے لیے کافی ہیں:

ایک یہ کہ اس بات کا فیصلہ کہ اہلِ پاکستان کے لیے کون سا نظام درست ہے اور کون سا درست نہیں ہے، دین، اخلاق اور اجتماعی مصالح کے لحاظ سے اہلِ پاکستان ہی کو کرنا چاہیے۔ ۱۹۷۳ء تک اہلِ پاکستان دانستہ یا نادانستہ طور پر مختلف نظام ہاے حکومت کا تجربہ کر چکے تھے۔ اس موقع پر ان کے منتخب نمائندوں نے بہت سوچ بچار کے بعد پارلیمانی نظامِ حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستانی قوم اپنے اس فیصلے پر ابھی تک قائم ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فیصلہ پاکستان کے قومی مفاد میں نہیں ہے تو انھیں رائے عامہ کو اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ہموار کرنا چاہیے، یہاں تک کہ لوگوں کی اکثریت ان کی رائے کو اپنی رائے کے طور پر اختیار کر لے۔ رائے عامہ کی تائید کے بغیر کیا جانے والا اجتماعی اقدام کسی لحاظ سے بھی درست قرار نہیں پا سکتا۔

دوسری یہ کہ سیاسی شعور کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلیم وتعلم سے کوئی ایسا گہرا تعلق بھی نہیں ہے کہ محض تعلیم کی کمی کو سیاسی شعور کی کمی پر محمول کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم اجتماعی شعور کی بیداری میں معاون ثابت ہوتی ہے، مگر حقیقی معنوں میں سیاسی شعور سیاسی عمل کے تسلسل اور استحکام سے پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو واضح ہو گا کہ اس قوم میں سیاسی شعور کی ایسی کمی نہیں ہے کہ اسے حقِ رائے دہی سے محروم کر دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں اس قوم نے اپنے ووٹوں ہی کے ذریعے سے علیحدہ مملکت اور اس کے لیے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۶۹ء میں اس قوم نے اپنی پرزور تحریک سے جنرل ایوب خان جیسے باجبروت حکمران کو اقتدار سے علیحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ کیا یہ سیاسی شعور کا اظہار نہیں ہے کہ اس قوم نے بتدریج مذہبی سیاست کو بالکلیہ ختم کر دیا اور ملک کو دو جماعتی نظام کی طرف گام زن کر دیا ہے؟ یہ بات صحیح ہے کہ ہماری عوامی سیاست ابھی تک جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے حصار سے نہیں نکلی، لیکن اس کی اصل وجہ عوام کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ناخواندگی نہیں، بلکہ سیاسی عمل میں بار بار آنے والا تعطل ہے۔ اگر یہ سیاسی عمل کسی انقطاع کے بغیر جاری رہے تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آیندہ تین چار انتخابات کے بعد شفاف نظامِ سیاست کے قیام اور باصلاحیت اور باکردار حکمرانوں کا انتخاب بہت آسان ہو جائے گا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے معروف محقق جناب ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب ''پاکستان ـــ تاریخ وسیاست'' میں لکھتے ہیں:

''تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ پاکستان کے عوام کی سیاسی پسماندگی کا رونا ان حکمرانوں نے رویا ہے جن کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں تھی۔ اس بدعت کا آغاز میجر جنرل سکندر مرزا سے ہوا۔ پھر یہ روایت فیلڈ مارشل ایوب خان سے ہوتی ہوئی صدر ضیاالحق تک پہنچی، کیونکہ یہ حکمران غیر سیاسی پس منظر کے مالک اور عوام سے الرجک تھے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے جو حقیقی معنوں میں قوم کے قائد تھے کبھی بھی عوام کی ناخواندگی یا سیاسی پسماندگی کی شکایت نہیں کی، حالانکہ اس وقت ناخواندگی کی شرح کہیں زیادہ تھی۔

دنیا میں کسی ایسے ملک کی مثال نہیں ملتی جس کے عوام نے اپنے ووٹ کے تقدس کے تحفظ کی خاطر اتنی قیمتی جانوں اور املاک کا نذرانہ پیش کیا ہو جتنا پاکستانی عوام نے ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کی تحریک کے دوران پیش کیا۔ یہ حقیقت میں پاکستان کے اس عام شہری کی فتح تھی جو ہر قیمت پر جمہوریت کی بالادستی کا خواہاں ہے۔ کیا ایک ایسی قوم کو جو اپنے ووٹ کے تقدس کا اس قدر شعور رکھتی ہے جمہوریت کے لیے نااہل قرار دینا ناانصافی نہیں ہے؟'' (۲۹۴)

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری عمل کے نتیجے میں جو سیاسی رہنما منظرِ عام پر آئے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اخلاقی پستی ہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حکومت کی زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینا ملک وقوم کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات کچھ ایسی غلط نہیں ہے، مگر اس کا علاج قومی اداروں کا انہدام نہیں، بلکہ ان کا استحکام ہے۔ ادارے جس قدر مستحکم ہوں گے احتساب کا نظام بھی اسی قدر بہتر ہو گا۔ اگر ہم اداروں کو ان کے بننے کے عمل سے پوری طرح گزرنے ہی نہیں دیں گے تو طالع آزما لوگ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر قربان کرتے رہیں گے۔ اداروں کا استحکام بھی سیاسی عمل کے تسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔

چوتھا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے لازمی نتیجے کے طور پر عوام اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں اور اجتماعی معاملات میں ان کی دلچسپی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال معاشرے کی صحت کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے۔ معاشرہ اسی وقت صحیح معنوں میں ترقی کی راہ پر گام زن ہوتا ہے جب اس کا ایک ایک فرد قومی تعمیر کے عمل میں پوری طرح شریک ہو۔ مگر جب وہ اپنے اور اپنی قوم کے مستقبل کے حوالے سے شبہات کا شکار ہو گا تو پوری دل جمعی کے ساتھ اپنا کردار ادا نہیں کر پائے گا۔ جنرل مشرف صاحب کے منصبِ صدارت پر متمکن ہونے کے بعد اہلِ پاکستان اس وقت ایسے ہی ترددات میں مبتلا ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا واقعی مقررہ مدت تک

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انتخابات ہو جائیں گے؟ انتخابات اگر ہوئے تو کیا وہ رائج نظام ہی کے تحت ہوں گے یا کوئی نیا نظام وضع کیا جائے گا؟ جنرل صاحب سابقہ جرنیلوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کریں گے یا وہ منتخب حکومت کو اقتدار سپرد کر دیں گے؟ قوم کے یہ ترددات جنرل صاحب کی نیت پر کسی شبہے کا اظہار نہیں ہیں، بلکہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کی اس مشہود حقیقت پر مبنی ہیں کہ فوج اگر ایک مرتبہ اقتدار میں آ جائے تو اپنی مرضی سے واپس نہیں جاتی۔

پانچواں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں فردِ واحد بلاشرکتِ غیرے اقتدار کا مالک بن جاتا ہے۔ کوئی فردِ واحد اپنی ذات میں بہت ایمان دار ہو سکتا ہے، اخلاق و کردار کے حوالے سے بہت بہتر ہو سکتا ہے، قیادت و سیادت کی بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہو سکتا ہے، سیاسی بصیرت سے بہرہ مند ہو سکتا اور قومی تعمیر کے لیے بہت متفکر ہو سکتا ہے۔ یہ تمام خصائص، بلاشبہ کسی فرد کی شخصی عظمت پر دلالت کرتے ہیں، لیکن ان سب کا کسی ایک شخص میں اجماع بھی اسے یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ عوام کی رائے کے بغیر مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے۔ دین و اخلاق اور فطرتِ انسانی کے مسلمات کے اعتبار سے اقتدار کے لیے صرف اور صرف ایک شرط ہے اور وہ رائے عامہ کی اکثریت کا اعتماد ہے۔ یہ اعتماد اگر حاصل ہے تو بے نظیر اور نواز شریف جیسے قائدانہ صلاحیتوں سے محروم اور سیاسی بصیرت سے بے بہرہ افراد کا اقتدار بالکل جائز ہے اور اگر یہ اعتماد حاصل نہیں ہے تو ضیاء الحق جیسے عظیم سیاسی مدبر اور جنرل پرویز مشرف جیسے ملک و قوم کے خیر خواہ کے اقتدار کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔

____ منظور الحسن

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۳۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَ اَنْ

لوگو، (اپنے اِنھی پیشواؤں کے پیدا کیے ہوئے توہمات کے تحت تم نے جو حلال و حرام ٹھیرائے ہیں، اُن کی کوئی حقیقت نہیں، اِس لیے) زمین کی چیزوں میں سے جو حلال و طیب ہیں، اُنھیں کھاؤ[۴۲۹] اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔[۴۳۰] وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔[۴۳۱] وہ تو یہی کرے گا کہ تمھیں برائی[۴۳۲] اور بے حیائی کی ترغیب دے[۴۳۳] اور اِس کی

---

[۴۲۹] اس سے معلوم ہوا کہ شرک اور تحلیل و تحریم، دونوں ایک دوسرے سے متعلق مضمون ہیں۔ چنانچہ اسی تعلق سے شرک کی تردید کے بعد اب یہ عربوں کو خطاب کر کے تمام جائز اور پاکیزہ چیزیں کھانے کی تلقین فرمائی ہے۔ سورۂ انعام (۶) کی آیات ۱۳۶ سے ۱۴۵ اور مائدہ (۵) کی آیت ۱۰۳ میں قرآن نے اُن چیزوں کی تفصیل کی ہے جو شیطان کی پیروی میں مشرکینِ عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حلال یا حرام ٹھیرائی تھیں۔

[۴۳۰] مطلب یہ ہے کہ خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھیرانے کی راہ تمھیں شیطان نے سجھائی ہے۔ اس کے لیے دین و شریعت میں کوئی سند نہیں ہے، لہٰذا اس کے سجھائے ہوئے اس راستے پر نہ چلو۔ قرآن میں دوسری جگہ بیان ہوا ہے کہ شیطان نے شروع ہی سے یہ چیز اپنے پروگرام میں شامل کر رکھی ہے کہ وہ اس طرح کے توہمات پیدا کر کے لوگوں کو توحید کی راہ

تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ، اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

کہ تم وہ باتیں اللہ کے نام لگاؤ[۴۳۴] جو تم نہیں جانتے۔۱۶۸۔۱۶۹

اور جب اِنھیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنی اِن باتوں کو چھوڑ کر) اُس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُسی راہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے پایا ہے۔ کیا اُس صورت میں بھی کہ اگر اِن کے باپ دادوں نے نہ اپنی عقل سے کام لیا ہو اور نہ راہِ ہدایت پائی ہو[۴۳۵]؟

سے ہٹائے گا۔ ملاحظہ ہو: سورۂ نساء (۴) آیت ۱۱۹۔

[۴۳۱] یعنی ایسا دشمن ہے جو ابتدا ہی سے نہایت کھلے ہوئے الفاظ میں تمھارے خلاف اعلانِ جنگ کر چکا ہے۔ شیطان کا یہ اعلان سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۶، ۱۷ میں نقل ہوا ہے۔

[۴۳۲] اصل میں لفظ 'سوء' استعمال ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ جس طرح بدی اور گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات اور مصائب کے لیے بھی آتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران (۳) کی آیت ۱۷۴ اور سورۂ نمل (۲۷) کی آیت ۱۲ میں اس کی نظیر موجود ہے، لیکن یہاں اس پر 'الفحشاء' کا عطف اور اس کے لیے 'یامرکم' کا فعل دلیل ہے کہ یہ بدی اور گناہ ہی کے معنی میں ہے۔

[۴۳۳] اصل میں لفظ 'امر' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ حکم دینے کے معنی میں بھی آتا ہے اور کوئی بات سجھانے یا اس کی ترغیب دینے کے معنی میں بھی۔ یہاں اس سے مراد شیطان کا ان باتوں کے لیے دلوں میں وسوسے ڈالنا اور انھیں نگاہوں میں کھبانا ہے۔ استاذ امام نے شیطان کی ان ترغیبات سے متعلق ایک خاص نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ رحمٰن اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی وفطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو ان کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آ سکتا۔ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لیے جائز ٹھیرائی ہیں، وہ اپنے اثرات، اپنے ظاہر اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوش گوار، معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں۔ اس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہ سب کی سب روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ، صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

اور (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ جنھوں نے (اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے اِس طرح) انکار کر دیا ہے، اِن کی تمثیل ایسی ہے، جیسے کوئی شخص اُن چیزوں کو پکارے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہ سنتی ہوں۔[۴۳۶] یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اِس لیے کچھ نہیں سمجھتے۔[۴۳۷] ۱۷۰۔۱۷۱

واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی کریں، ان کی شامت ہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۱۱)

[۴۳۴] اصل الفاظ ہیں: 'وان تقولوا علی اللّٰہ مالا تعلمون'۔ ان کے معنی وہی ہیں جو 'افتراء علی اللّٰہ' کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ فلاں اور فلاں کو اللہ نے یہ اختیارات دے رکھے ہیں یا بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں اور فلاں چیز حرام ہے۔

[۴۳۵] مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کے ورثہ کو بے شک، احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے، لیکن اس کی صحت وصداقت ثابت کرنے کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ فلاں اور فلاں چیز باپ دادا سے اسی طرح چلی آ رہی ہے۔ اس پر اگر کوئی تنقید کی جاتی ہے تو ہر سلیم الطبع انسان کو چاہیے کہ وہ اسے توجہ سے سنے اور اگر وہ چیز علم وعقل کی میزان پر پوری نہ اترتی ہو تو بغیر کسی تردد کے اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔

[۴۳۶] یہ بھیڑ بکریوں کے گلے کی تمثیل ہے جسے چرواہا پکارتا ہے تو اس کی آواز، بے شک اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے، لیکن اس سے آگے اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ چرواہا کیا کہہ رہا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اس طرح کی تمثیلات میں ایک صورتِ حال کی تمثیل دوسری صورتِ حال سے دی جاتی ہے۔ اس کے لیے ممثل اور ممثل بہ کے تمام اجزا کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی۔

[۴۳۷] یعنی تمام عقلی اور روحانی خصوصیات سے بالکل محروم ہیں۔ ان میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

تقدیر کا اثر

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۸۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال: حدثنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم و ھو الصادق المصدوق: إن خلق أحدکم یجمع فی بطن أمہ أربعین یوماً نطفةً ـ ثم یکون علقةً مثل ذلک ـ ثم یکون مضغةً مثل ذلک، ثم یبعث إلیہ ملکاً بأربع کلمات: فیُکتَب عملہ، وأجلہ، و رزقہ، و شقی و سعید ـ ثم ینفخ فیہ الروح ـ فوالذی لا إلہ غیرہ، إن أحدکم یعمل بعمل أھل الجنة حتی ما یکون بینہ و بینھا إلا ذراع، فیسبق علیہ الکتاب، فیعمل بعمل أھل النار فیدخلھا ـ و إن أحدکم لیعمل بعمل أھل النار حتی ما یکون بینہ و بینھا إلا ذراع، فیسبق علیہ الکتاب، فیعمل بعمل أھل الجنة فیدخلھا ـ

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سچے ہیں اور جن کی تصدیق کی گئی ہے، فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے وجود کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک

نطفے کی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ پھر اسی طرح علقہ کی حالت میں۔ پھر اسی طرح مضغہ کی حالت میں۔ پھر اللہ تعالیٰ چار باتیں دے کر ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کے اعمال، زندگی، رزق اور شقاوت وسعادت لکھ دیتا ہے۔ پھر وہ اس میں روح پھونکتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، معاملہ یہ ہے کہ تم میں سے ایک شخص اہلِ جنت والے اعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے بیچ ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر لکھا اس پر غالب آ تا ہے، چنانچہ وہ اہلِ جہنم والے اعمال اختیار کر لیتا ہے، نتیجۃً جہنم میں جا پہنچتا ہے۔ اور تم میں سے ایک شخص اہلِ جہنم والے اعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے بیچ ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر لکھا اس پر غالب آ تا ہے، چنانچہ وہ اہل جنت والے اعمال اختیار کر لیتا ہے، نتیجۃً جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

الصادق و المصدوق : لفظی مطلب ہے سچ بولنے والا اور جسے سچا قرار دیا گیا ہو۔ یہاں اس سے وہ سچا مراد ہے جو اپنی اس بات میں بھی سچا ہو جسے وہ پیش کر رہا ہو۔

نطفة : مادہ منویہ۔ یہاں رحمِ مادر میں قرار پکڑنے کے بعد کی پہلی حالت ہے۔

مضغة : گوشت کا لوتھڑا۔ یہ علقہ کے بعد کا مرحلہ ہے۔

علقة: خون کی پھٹکی، چھوٹا جان دار کیڑا۔

شقی و سعید: ظاہر ہے ان کا عطف رزق وغیرہ پر درست نہیں۔ اس صورت میں 'شقی و سعید' کے بجائے 'شقاوت و سعادت' کے الفاظ ہونے چاہییں۔ 'شقی و سعید' کی صورت میں یہ مبتداے محذوف کی خبر ہیں۔

الکتاب: کتابِ تقدیر یعنی لوحِ محفوظ۔

متون

اس روایت کے متون میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ کچھ الفاظ کی کمی بیشی یا جملوں کے فرق کے ساتھ ایک ہی روایت تمام کتب میں درج ہوئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں پہلے جملے میں 'نطفة' نہیں ہے۔ ایک روایت میں یہی جملہ 'إن النطفة

تکون فی الرحم أربعین یوماً‘ کے الفاظ میں ہے۔بعض روایات میں ’إن خلق أحد کم‘ کی جگہ ’إن احد کم‘ کے الفاظ بھی ہیں۔کسی روایت میں ’بأربع کلمات‘ کے بجائے ’فیؤمر بأربع کلمات فیقول اکتب عمله ......‘ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ایک روایت میں ’رزق‘ کا ذکر نہیں ہے۔کچھ روایات میں نفخِ روح کا ذکر نہیں ہے۔بعض روایات میں ’ذراعا‘ کے بارے میں ’أو ذراعین أو باع‘ (دونوں ہاتھوں کے پھیلانے کے برابر لمبائی) کہہ کر شک ظاہر کیا گیا ہے۔ایک روایت میں ’فیسبق علیه الکتاب‘ کے بجائے ’فیغلب یا ثم یدرکه الکتاب الذی سبق علیه‘ کے الفاظ آئے ہیں۔بعض روایات میں ’فیعمل بعمل اهل النار‘ کی جگہ ’فیختم له بعمل اهل النار‘ کے الفاظ میں تقدیر کے اثر انداز ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔اس روایت کے آخر میں ’یدخلها‘ ہے۔ایک روایت میں اس جملہ کی جگہ ’قبل أن یموت‘ کے الفاظ نے لے لی ہے۔

ایک روایت میں تخلیق کے مراحل کو ان الفاظ میں تعبیر کیا گیا ہے:

إن النطفة تستقر فی الرحم أربعین لیلة، ثم تنحدر دما۔ ثم تکون علقة۔ ثم تکون مضغة۔ ثم یبعث إلیه ملکا۔ فیکتب رزقه و خلقه و شقی أو سعید۔

”نطفہ چالیس راتیں رحم میں برقرار رہتا ہے، پھر خون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔پھر علقہ بن جاتا ہے۔پھر مضغہ۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتے ہیں۔وہ اس کا رزق اس کی تخلیق اور اس کی بدنصیبی اور خوش نصیبی لکھ دیتا ہے۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نووی نے اس روایت کی شرح کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ بعض روایات میں نطفے کے لیے چالیس کے بجائے بیالیس راتوں کے گزرنے کا ذکر ہے۔بعض میں چالیس اور کچھ راتوں کا بیان ہے۔بعض روایات میں یہ تصریح ہے کہ پہلے چالیس بیالیس دن گزرنے پر فرشتہ آتا ہے اور صورت گری کرتا ہے۔

معنی

اس روایت کے دو حصے ہیں۔ایک حصہ تخلیق کے مراحل سے متعلق ہے اور دوسرا تقدیر سے متعلق۔پہلے حصے میں ایک اضافے کے ساتھ وہی مراحل بیان ہوئے ہیں جو قرآنِ مجید میں بیان ہوئے ہیں۔وہ اضافہ یہ ہے کہ روایت میں یہ مراحل وقت کی توضیح کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، جبکہ قرآنِ مجید میں یہ مضمون وقت کی تعیین کے بغیر بیان ہوا ہے۔بظاہر اس تعیین کے ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، الّا یہ کہ اسے تقریباً چالیس دن کے معنی میں لیا جائے۔اور یہ بات اس روایت کے دوسرے متون سے بھی واضح ہوتی ہے کہ کسی روایت میں بیالیس کسی میں تینتالیس اور کسی میں پینتالیس کے الفاظ بھی آئے ہیں اور یہ دن کسی مرحلے میں کچھ کم بھی ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح نفخِ روح کا ذکر بھی قرآنِ مجید میں ہوا ہے۔ اور اس میں بھی یہ روایت جس تخصیص کو بیان کرتی ہے، قرآنِ مجید میں کوئی بات اس کے منافی نہیں ہے، بلکہ دونوں میں مناسبت ہی ہے۔

تقدیر کے معاملے میں اس روایت میں دو الگ الگ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ زندگی، موت، رزق وغیرہ، لاریب تقدیر کا موضوع ہیں اور اس میں کوئی اشکال بھی نہیں ہے۔ شقی اور سعید یا اعمال کے الفاظ آخرت سے بھی متعلق ہیں۔ آخرت کا معاملہ سرتاسر انسان کی آزادی اور اختیار سے متعلق ہے۔ لہٰذا اس کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ان امور کا لکھا جانا اللہ تعالیٰ کے مستقبل کے علم کے تحت ہے۔ یہ امور اسی طرح لکھے گئے ہیں کہ انسان اپنی مکمل آزادی کو استعمال کرتے ہوئے فلاں فلاں نیکیاں یا بدیاں اختیار کرے گا، اور اس طرح شقی یا سعید بن جائے گا۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان کو برائیوں کے غلبے کی صورت میں مایوس ہونے سے روکا ہے اور اس امکان کی طرف متوجہ کیا ہے کہ زندگی کے ہوتے ہوئے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے کا موقع موجود ہے۔ اس حدیث میں گنہ گاروں کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اہلِ جہنم سے نکل کر اہلِ جنت کے زمرے میں شامل ہو جائیں، اور نیکیوں کے غلبے کی صورت میں بے پروا ہونے سے روکا ہے، اور واضح کیا ہے کہ زندگی کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی جنتی ہونے کا مستحق ہو، لیکن وہ شیطان کے بہلاوے میں آ گئے اور اپنی راہ کھوٹی کر لے، اور پھر برائیوں میں اس طرح غلطاں ہو کہ جہنم میں جا پڑے۔ لہٰذا نیک لوگوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے بارے میں برائیوں کے حوالے سے ہمیشہ چوکنا رہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ۶۔ کتاب احادیث الانبیاء، باب ۱، کتاب القدر، باب ۱۔ سنن ترمذی، کتاب القدر، باب ۴۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب ۱۷۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المقدمہ، باب ۱۰۔ مسند احمد، مسند عبداللہ بن مسعود۔ صحیح ابن حبان، ج ۱۴، ص ۴۷۔ الجامع لمعمر بن راشد، ج ۱۱، ص ۱۲۳۔ مسند البزاز، ج ۵، ص ۱۷۰۔ مسند الطیالسی، ج ۱، ص ۳۸۔ مسند ابن الجعد، ج ۱، ص ۳۷۹۔ المعجم الکبیر، ج ۹، ص ۱۷۸۔ ج ۱۰، ص ۱۹۵۔

جاوید احمد غامدی

قانونِ جہاد

(۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmedghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسیرانِ جنگ

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ، حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، فَاِمَّا مَنًّام بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا۔ (محمد۴۷: ۴)

''پھر جب اِن منکرینِ حق سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب ان کا خون اچھی طرح بہا دو تو انھیں مضبوط باندھ لو۔ اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ نا ہے یا فدیہ لے کر رہا کر دینا ہے، اُس وقت تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔''

آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے، جب عملاً کوئی جنگ تو ابھی مسلمانوں کو پیش نہیں آئی تھی، مگر حالات بتا رہے تھے کہ یہ کسی وقت بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو بتایا گیا کہ سرزمینِ عرب کے ان منکرینِ حق سے اگر مڈبھیڑ ہوتی ہے تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے۔ پیغمبر کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد اپنے کفر پر اصرار کے باعث یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں رہے، لہٰذا مقابلے پر آئیں تو ان کا اچھی طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ جو باقی رہ جائیں، انھیں قیدیوں کی حیثیت سے باندھ لو۔ اللہ کی مدد تمھارے ساتھ ہے، اس لیے وہ تمھارے سامنے کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ پھر تمھیں اختیار ہے کہ چاہو تو احسان کے طور پر انھیں رہا کر دو اور چاہو تو ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ تمھارا یہی

معاملہ اس وقت تک ان کے ساتھ رہنا چاہیے، جب تک ان میں جنگ کا حوصلہ بالکل ختم نہیں ہو جاتا۔[41]

سورۂ محمد کا یہ حکم اگرچہ مشرکینِ عرب کے حوالے سے بیان ہوا ہے، لیکن اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اسے انھی کے ساتھ خاص قرار دیتی ہو، لہٰذا دوسرے مقاتلین بھی تبعاً اس میں شامل سمجھے جائیں گے۔

اس کے الفاظ ہیں: '**فاما منا بعد و اما فداء**'۔ زبان کے اداشناس جانتے ہیں کہ '**فداء**' کے معنی اگر اس میں فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے ہیں تو '**اما**' کے ساتھ اس کے مقابل میں ہونے کی وجہ سے '**منّا**' کے معنی بھی احسان کے طور پر رہا کر دینے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ '**منّا**' یہاں فعلِ محذوف کا مصدر ہے اور قتل کے مقابل میں نہیں، بلکہ فدیے کے مقابل میں آیا ہے، اس لیے یہ بالکل قطعی ہے کہ اس کے معنی بلا معاوضہ رہا کر دینے ہی کے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو مسلمان چھوڑ بھی سکتے تھے، ان سے فدیہ بھی لے سکتے تھے اور جب تک وہ قید میں رہتے، قرآنِ مجید کی رو سے، ملک یمین کی بنا پر ان سے کوئی فائدہ بھی اٹھا سکتے تھے، مگر انھیں قتل کرنے یا لونڈی غلام بنا کر رکھنے کی گنجایش اس حکم کے بعد ان کے لیے باقی نہیں رہی۔

تین قسم کے قیدی، البتہ اس سے مستثنیٰ تھے:

ایک وہ معاندین جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ قانونِ اتمامِ حجت کی رو سے جہاں پائے جائیں، فوراً قتل کر دیے جائیں، جیسے بدر و احد کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط، نضر بن الحارث[42] اور ابوعزہ۔[43] اسی طرح مکہ کے وہ چند افراد جو اس کی فتح کے موقع پر عام معافی سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔[44]

دوسرے بنوقریظہ کے قیدی جن پر خود ان کے مقرر کردہ حکم نے انھی کا قانون نافذ کیا جس کے نتیجے میں ان کے مرد قتل کر دیے گئے، اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔[45]

تیسرے وہ قیدی جو پہلے سے لونڈی غلام تھے اور بعض موقعوں پر اسی حیثیت سے لوگوں میں تقسیم کیے گئے۔[46]

یہ تینوں اقسام تو صاف واضح ہے کہ سورۂ محمد کے اس حکم سے متعلق ہی نہیں تھیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ لہٰذا ان سے قطعِ نظر کر کے اگر اس معاملے میں زمانۂ رسالت کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی

۴۱؎ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد جو معاملہ ان کے ساتھ کرنا پیشِ نظر تھا، اس میں اسلام اور تلوار کے سوا کسی تیسری صورت کی گنجایش نہ تھی۔

۴۲؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۱۵۔

۴۳؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۸۳۔

۴۴؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۴۱۔

۴۵؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۱۸۸۔۱۸۹۔

۴۶؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۱۰۵۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے عام قیدیوں کے ساتھ کوئی معاملہ اس حکم سے ہٹ کر نہیں کیا، بلکہ جو کچھ کیا ہے، ٹھیک اس کی پیروی میں کیا ہے۔

تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ قیدی جب تک حکومت کی قید میں رہے، ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا گیا۔ بدر کے قیدیوں کے بارے میں معلوم ہے کہ انھیں صحابہ کے گھروں میں بانٹ دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ 'استوصوا بالاساری خیراً'[۴۷] (ان قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا)۔ ان میں سے ایک قیدی ابوعزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے گھر میں رکھا گیا، وہ صبح وشام مجھے روٹی کھلاتے اور خود صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔[۴۸] یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال گرفتار ہوئے تو جب تک قید میں رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمدہ کھانا اور دودھ ان کے لیے مہیا کیا جاتا رہا۔[۴۹]

۲۔ بدر کے زیادہ تر قیدی فدیہ لے کر چھوڑے گئے۔ ان میں سے جو لوگ مالی معاوضہ دے سکتے تھے، ان سے فی قیدی ایک ہزار سے چار ہزار تک کی رقمیں لی گئیں اور جو مالی معاوضہ دینے کے قابل نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ابوسفیان کا بیٹا عمرو، سعد بن نعمان کے بدلے میں جنھیں ابوسفیان نے قید کر لیا تھا، رہا ہوا۔[۵۰] غزوہ بنی المصطلق کے قیدیوں میں سے سیدہ جویریہ کو بھی ان کے والد حارث بن ابی ضرار نے فدیہ دے کر آزاد کرایا۔[۵۱] سیدنا ابوبکر صدیق ایک مہم پر بھیجے گئے۔ وہاں انھوں نے قیدی پکڑے تو ان میں ایک نہایت خوب صورت عورت بھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکہ بھیج کر اس کے بدلے میں کئی مسلمان قیدی رہا کرا لیے۔[۵۲] بنی عقیل کے ایک قیدی کو طائف بھیج کر قبیلۂ ثقیف سے مسلمانوں کے دو آدمی بھی اس طرح رہا کرائے گئے۔[۵۳]

۳۔ بعض قیدی بغیر کسی معاوضے کے رہا کیے گئے۔ بدر کے قیدیوں میں سے ابوالعاص، مطلب بن حنطب، صیفی بن ابی رفاعہ اور ابوعزہ، اور بنو قریظہ کے قیدیوں میں سے زبیر بن باطا اسی طرح رہا ہوئے۔[۵۴] صلح حدیبیہ کے موقع پر مکہ کے ۸۰ آدمیوں نے تنعیم کی طرف سے آ کر شب خون مارا۔ یہ سب پکڑ لیے گئے اور حضور نے انھیں اسی طرح آزادی عطا فرمائی۔[۵۵] ثمامہ بن اثال،

۴۷؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۱۷۔

۴۸؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۱۷۔

۴۹؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۲۱۵۔

۵۰؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۲/ ۲۲۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۲۱۔

۵۱؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۳۲۔

۵۲؎ ابن ماجہ، رقم ۲۸۴۶۔

۵۳؎ احمد بن حنبل، رقم ۱۹۳۲۶۔

۵۴؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۲۸، ۳/ ۱۹۰۔

۵۵؎ ابوداؤد، رقم ۲۶۸۸۔

جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، وہ بھی اسی طرح رہا کیے گئے۔[56]

۴۔ بعض موقعوں پر قیدی لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے کہ 'فاما منّا بعدو اما فداء' کے اصول پر وہ ان سے یا ان کے متعلقین سے خود معاملہ کر لیں۔ چنانچہ غزوہ بنی المصطلق کے قیدی اسی طرح لوگوں کو دیے گئے، لیکن سیدہ جویریہ کے آزاد ہو جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا تو تمام مسلمانوں نے اپنے اپنے حصے کے قیدی یہ کہہ کر بغیر کسی معاوضے کے چھوڑ دیے کہ اب یہ حضور کے رشتہ دار ہو چکے ہیں۔ اس طرح سو خاندانوں کے آدمی رہا ہوئے۔[57] سریۂ ہوازن کے قیدی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے لے کر اسی طرح رہا کرا دیے۔[58] غزوۂ حنین کے موقع پر بھی یہی ہوا۔ قبیلۂ ہوازن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے آیا تو قیدی تقسیم ہو چکے تھے۔ انھوں نے درخواست کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا: یہ لوگ تائب ہو کر آئے ہیں۔ میری رائے ہے کہ ان کے قیدی چھوڑ دیے جائیں۔ تم میں سے جو بلا معاوضہ چھوڑنا چاہے، وہ اس طرح چھوڑ دے اور جو معاوضہ لینا چاہے، اسے حکومت کی طرف سے معاوضہ دیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں چھ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے اور جن لوگوں نے معاوضے کا مطالبہ کیا، انھیں حکومت کی طرف سے معاوضہ دے دیا گیا۔[59]

۵۔ جو عورتیں اسی اصول پر لوگوں کو دی گئیں اور ان کے ماں باپ، شوہر وغیرہ جنگوں میں مارے گئے تھے، ان سے لوگوں نے بالعموم انھیں آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ خیبر کے قیدیوں میں سے سیدہ حفصہ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔[60]

(باقی)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۵۶؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔

۵۷؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۳۱۔

۵۸؎ السیرۃ النبویہ، ابن کثیر ۳/ ۴۵۳۔

۵۹؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۱۰۴۔ ۱۰۶۔

۶۰؎ بخاری، رقم ۴۲۰۰۔

محمد بلال

معرکۂ بدر ـــــ ایک خاص معرکہ

ہمارے ہاں بسا اوقات معرکۂ بدر کو بالکل ایک عام جنگ کے طور پر بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس کے صرف مادی پہلووں ہی پر گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ تاریخ کو قرآن کی روشنی میں نہ دیکھنے کے باعث ہوتا ہے۔ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ معرکۂ بدر کی قرآنِ مجید کی روشنی میں وضاحت کی جائے اور اس کی اصل حقیقت لوگوں کے سامنے لائی جائے۔

اصل میں جب اس دنیا پر عدل وانصاف کے پہلو سے غور کیا جائے تو دیدۂ بینا اور دلِ دردمند رکھنے والا ہر شخص افسردہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں کامل عدل نہیں پاتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ قوت اور اقتدار رکھنے والا کسی آئین، کسی قاعدے، کسی ضابطے کی پروا نہیں کرتا۔ اور اس کی اس قوت کے باعث کوئی شخص اس کے خلاف کسی اقدام کی بھی جرأت نہیں کرتا۔ رشوت خور اور چاپلوس پرآسایش، بلکہ پرتعیش زندگی گزارتا ہے، مگر ایمان دار اور خوددار کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ جھوٹا اور دغاباز محل میں رہتا ہے، مگر سچا اور دیانت دار جھونپڑی میں رہتا ہے۔ غرض یہ کہ جس جس پہلو سے بھی غور کیا جائے ظلم وزیادتی کی مختلف شکلیں نمودار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال میں ایک حساس شخص کو خودکشی کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں یہ قیامت کا تصور ہے جو اس راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ یہ تصور بتاتا ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور پھر ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی، جہاں کامل عدل ہوگا۔ جہاں سارا زور واختیار صرف خدا کا ہوگا۔ اس وقت وہ کسی رعایت کے بغیر ٹھیک ٹھیک عدل کر دے گا۔ جہاں رشوت خور، جھوٹے اور دغاباز سزا پائیں گے اور ایمان دار، سچے اور دیانت دار جزا پائیں گے۔

قیامت کا یہ تصور انسان کو دنیا میں راہِ راست پر رکھنے میں اہم کردار کرتا ہے، لہٰذا یہ تصور خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچایا۔ پھر انسان کے اندر بھی یہ شعور رکھا جس کے باعث عقل دنیا پر غور کرنے کے بعد تقاضا کرتی ہے کہ قیامت ہونی چاہیے۔ ایمان دار کو جزا اور بے ایمان کو سزا ملنی چاہیے۔ اس کے علاوہ خدا نے انسانوں پر قیامت کے تصور کی حقانیت کو مزید واضح کرنے کے لیے ایک اور غیر معمولی حسی اہتمام کیا ہے۔ اس نے رسولوں کے ذریعے سے اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

زمین پر چھوٹے پیمانے پر قیامت برپا کر کے دکھا دی تا کہ اس معاملے میں کسی قسم کا کوئی شک باقی نہ رہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اس ''قیامت صغریٰ'' کا ذکر ہوا ہے۔

قرآنِ مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیامتِ صغریٰ دو صورتوں میں برپا ہوتی رہی۔

ایک صورت میں یہ ہوتا ہے کہ رسول[1] ایک قوم تک خدا کا دین پہنچاتا ہے۔ دین اچھی طرح سمجھاتا ہے۔ مخالفوں کے ہر اعتراض کو رفع کرتا ہے۔ ان کے ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ غرض یہ کہ دین کو ہر پہلو سے واضح کرتا ہے، مخالفوں کے ہر ظلم کو سہتا ہے اور خود کو اخلاق و کردار کے اعلیٰ معیار پر قائم رکھتا ہے۔ اس کے بعد بھی جب قوم سرکشی پر تلی رہتی ہے اور خدا کے دین کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی تو وہ رسول خدا کے اِذن سے دوسرے علاقے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر قدرتی آفات کے ذریعے سے ایک عذابِ الٰہی آتا ہے اور سرکشوں کو اِسی دنیا میں موت کی سزا دے دی جاتی ہے۔ دوسری طرف رسول اور اس کے ساتھیوں کو جزا کے طور پر غلبہ عطا کیا جاتا ہے۔ قومِ نوح، قومِ لوط، قومِ صالح، قومِ شعیب کو اس پہلو سے موت کی سزا دی گئی۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ فرعون کی سزا اور حضرت موسیٰ کی جزا کا ذکر سورۂ اعراف میں کچھ اس طرح ہوا ہے:

''تو ہم نے ان کو کیفرِ کردار کو پہنچا دیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا بوجہ اس کے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے۔ اور جو لوگ دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ کر دیے۔'' (۱۳۶۔۱۳۷)

دوسری صورت یہ کہ اگر رسول کو ہجرت کے بعد کسی خطۂ ارض میں سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے تو پھر سرکش قوم کو سزا اس کے لشکر کی تلواروں کے ذریعے سے ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے سرکشوں کے ساتھ یہی معاملہ ہونا تھا۔ ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب میں سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا، لہٰذا اب کفار پر عذابِ الٰہی لشکرِ نبوی کے ذریعے سے آنا تھا۔ اس ضمن میں بعد میں سورۂ توبہ میں کفار کو قتل کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سزا کے نفاذ کے لیے مکہ میں لشکر کشی بھی کی، مگر کفار نے اسلام قبول کر لیا۔

بہر حال اس وقت معرکۂ بدر زیر بحث ہے، اس لیے ہم دوبارہ اس کی طرف آتے ہیں۔

جب مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست قائم ہوئی تو کفار نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ مدینہ میں مسلمانوں کے قوت بننے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہراہ ان کے لیے محفوظ نہیں رہی۔ وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر ملے اور مسلمانوں کو قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ کفارِ مکہ کے ایک

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ قیامت صغریٰ برپا کرنے کا معاملہ نبیوں کے ذریعے سے نہیں، بلکہ رسولوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تجارتی قافلے نے مدینہ کے قریب سے گزرنا تھا۔ ابوسفیان قافلۂ تجارت کے سالار تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے وہمی خطرے کی وجہ سے قریش کو مسلمانوں پر حملے کے لیے کہا یا قریش کے لیڈروں نے کوئی سازش تیار کی، بہرحال تجارتی قافلے کی حفاظت کے بہانے ایک بھاری بھرکم لشکر مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

ادھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رویا کے ذریعے سے اس لشکر کی آمد کا مشاہدہ کرا دیا۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت پہلے ہی سے واضح کر دی کہ یہ لشکر مسلمانوں سے مغلوب ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ کفار کے خاص خاص لیڈر قتل ہو کر جہاں جہاں گریں گے، وہ جگہیں بھی رویا میں دکھا دیں۔ مسلمانوں کو کفار کے خلاف نکلنے کا جو اللہ نے حکم دیا، اس کی وجہ اس طرح بیان کی کہ:

''اللہ تعالیٰ اپنے حکموں سے یہ چاہتا ہے کہ حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔'' (الانفال ۸: ۷۔۸)

یعنی فتح کی نوید حکم کے ساتھ ہی سنا دی۔ چنانچہ مسلمان اور کفار آمنے سامنے ہوئے، معرکہ ہوا اور کفار کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ ان کے بڑے بڑے سردار انھی جگہوں پر قتل ہوئے جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے دے دی گئی تھی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت قرآنِ مجید میں واضح کر دی ہے کہ معرکۂ بدر مسلمانوں کی کسی تدبیر یا تدبر کا کرشمہ نہیں تھا۔ یعنی خدا نے حضور کو رویا کے ذریعے سے کفار کے لشکر کی خبر پہلے سے دے دی۔ رویا میں کفار کا لشکر کم کر کے دکھایا تاکہ مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا نہ ہو اور ان کا مورال نہ گرے۔ جنگ سے قبل میدان میں مسلمانوں کو پانی میسر نہ آیا تو آسمان سے پانی برسا دیا۔ سخت تناؤ کے حالات میں بھی مسلمانوں پر نیند طاری کر دی، جس سے وہ تازہ دم ہو گئے۔ جب مسلمانوں کا کفار کے لشکر سے آمنا سامنا ہوا تو کفار کو مسلمانوں کا لشکر بڑا دکھائی دیا اور مسلمانوں کو کفار کا لشکر چھوٹا نظر آیا۔ حضور نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور کفار کی طرف پھینکی، جو ایسا طوفان بن گئی جس سے کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ گئی۔ فرشتے بطور کمک میدانِ بدر میں اترے، جس سے کفار کے سر گاجر مولی کی طرح کٹے۔

دیکھ لیجیے، سورۂ انفال میں معرکۂ بدر ہی کے حوالے سے بیان ہوا ہے:

''یاد کرو جب اللہ تیری رویا میں ان کو کم دکھاتا ہے۔ اور اگر زیادہ دکھا دیتا تو تم پست ہمت ہو جاتے اور معاملے میں اختلاف کرتے، لیکن اللہ نے بچا لیا۔ بے شک وہ دلوں کے حال سے باخبر ہے۔ اور خیال کرو جب کہ تمھاری مڈبھیڑ کے وقت ان کو تمھاری نظروں میں کم دکھاتا ہے اور تم کو ان کی نظروں میں کم دکھاتا ہے تاکہ اس امر کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے شدہ تھا اور سارے معاملات اللہ ہی طرف لوٹتے ہیں۔'' (۸: ۴۳۔۴۴)

''اور یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد سنی کہ میں ایک ہزار فرشتے تمھاری کمک پر بھیجنے والا ہوں جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے۔ اور یہ صرف اس لیے کیا کہ تمھارے لیے خوش خبری ہو اور اس

سے تمھارے دل مطمئن ہوں۔ اور مدد تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم کو چین دینے کے لیے اپنی طرف سے تم پر نیند طاری کر دیتا ہے اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تاکہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کے وسوسے کو دفع کرے اور تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے۔ یاد کرو جب تمھارا رب فرشتوں کو وحی کرتا ہے کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔ یہ اس سبب سے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کو اٹھے ہیں اور جو اللہ و رسول کے مقابلہ کو اٹھتے ہیں تو اللہ ان کے لیے سخت پاداش والا ہے۔ سو یہ تو نقد چکھو اور کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔'' (۸: ۹۔۱۴)

''پس تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی کہ اللہ اپنی شانیں دکھائے اور اپنی طرف سے اہل ایمان کے جوہر نمایاں کرے۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا سامنے ہے اور اللہ کافروں کے سارے داؤں بے کار کر کے رہے گا۔'' (۸: ۱۷۔۱۸)

اس کے علاوہ مزید دیکھیے، فتح کے بعد جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اس کے بارے میں بعض کمزور قسم کے مسلمانوں میں نزاع پیدا ہو گئی کہ اس کی تقسیم کس طرح ہونی چاہیے تو اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں پر واضح کر دیا کہ یہ مال اللہ اور رسول کا ہے، (یعنی مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہے)، اس کے ساتھ وہ جو چاہیں گے، معاملہ کریں گے۔ سورۂ انفال ہی میں ہے:

''وہ تم سے غنائم کے بارے میں پوچھتے ہیں، انھیں بتا دو کہ غنائم سب اللہ اور رسول کے لیے ہیں۔ (۸: ۱)

اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ جنگ تو دراصل اللہ تعالیٰ نے لڑی تھی۔ اس میں مسلمانوں کی حیثیت محض ایک ذریعے کی سی تھی۔ لٰہذا معرکۂ بدر خدا کے دنیا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ''قیامتِ صغریٰ'' برپا کرنے کے سلسلے کی ابتدا تھی۔ چنانچہ اس میں عام سرکش کفار کے ساتھ ساتھ ان کے سرداروں کو عبرت ناک موت کی سزا دی گئی۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مشہور کتاب ''سیرت النبی'' میں جنگِ بدر کو صرف مادی پہلو سے دیکھنے والوں پر تنقید کی، مگر حیرت ہے کہ پھر ان کی تائید میں لکھنا شروع کر دیا۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ضمن میں انھوں نے جو اسباب بیان کیے، وہ بھی درحقیقت اور زیادہ تر ''غیر مادی'' ہی تھے۔ شبلی نے لکھا:

''مغربی مورخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسبابِ ظاہر کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا، پر کیونکر فتح پائی، لیکن تائیدِ آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔ تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں۔ اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردارِ لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا۔ قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آ کر واپس چلے گئے۔ پانی برسنے سے موقعِ جنگ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا۔ قریش مرعوب ہو کر اسلامی

فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے یعنی اپنی تعداد سے دوگنا۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے:

یَـرَوْنَهُـمْ مِثْـلَيْهِـمْ رَأْیَ الْـعَيْـنِ۔ (آل عمران ۳:۱۳)

''وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔''

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دستِ مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں۔ مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔'' (۱/۲۰۱۔۲۰۲)

قیامتِ کبریٰ کی یاددہانی اور دنیا میں اس کا ایک حسی نمونہ دکھانے کے بیان کا یہ جو سلسلہ قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ اسی طرح احادیث اور سیرت کی کتابوں میں بھی بیان کیے گئے بہت سے واقعات اسی سلسلے کی کڑی ہیں، مگر ہمارے ہاں ان واقعات کو اس مخصوص پس منظر کے بغیر سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے غلط فہمیوں اور کج فکریوں کی ایک دنیا وجود میں آ جاتی ہے جو مسلمانوں کو بالخصوص اور غیر مسلمانوں کو بالعموم مشکلات میں ڈال دیتی ہے۔

کاش! اہل اسلام قرآن، حدیث اور تاریخ میں موجود اس مخفی حقیقت کو دیکھ سکیں، اسے سمجھ سکیں اور اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے نقطۂ نظر اور لائحۂ عمل تشکیل دے سکیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

فہم حدیث اور فقہاے امت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآنِ مجید اور سنتِ متواترہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات دین کا تیسرا بنیادی ماخذ ہیں۔ قرآن کی نص کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کی آیات کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ان کی تبیین وتفصیل اور صحابہ کی تربیت وتزکیہ کے منصب پر بھی فائز تھے، اور آپ نے اپنے اقوال وافعال سے یہ ذمہ داری لامحالہ انجام دی۔ چنانچہ قرآن کی اصولی ہدایات اور سنت کی شکل میں نقل ہونے والے دین کے بنیادی ڈھانچے کے مختلف جزوی پہلوؤں کی تفصیل اور ان کی حکمت معلوم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے رجوع دین کے مکمل اور جامع فہم کے لیے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

حدیث کی اس نوعیت سے پہلی بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اس کا مطالعہ درحقیقت چند انفرادی اور غیر مربوط اقوال کا مطالعہ نہیں ہے، بلکہ عقل وحکمت کے لحاظ سے ایک نہایت منضبط اور مربوط نظام کا مطالعہ ہے۔ حدیث کی معنویت اور دین میں اس کا صحیح مقام اس کے بغیر واضح ہی نہیں ہوسکتا کہ قرآن میں بیان ہونے والے حکمتِ دین کے بنیادی اصولوں کو سمجھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ان کی توسیع بے شمار فروع کی طرف کی ہے، ان تمام اجزا کا اپنی اصل کے ساتھ، نیز ایک دوسرے کے ساتھ باہم کیا ربط ہے، اور دین کی عمارت میں کون کون سی اینٹ کہاں کہاں فٹ بیٹھتی ہے۔

دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ فہمِ حدیث میں اہل علم کے مابین اختلافِ رائے کا پیدا ہو جانا ایک بالکل فطری چیز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، حدیث قرآن اور عقل وحکمت کی اساس پر مبنی ایک نہایت گہرے نظام کی تشریح ہے اور ایک حکیمانہ نظام کے فہم میں اہل علم کے شخصی اذواق اور انفرادی زاویہ ہاے نظر کے اختلاف سے رائے کے اختلاف کا وجود

میں آ جانا کوئی بعید بات نہیں۔ اور دوسرے اس لیے کہ اس قسم کے کسی نظام کا فہم و تدبر نہایت اعلیٰ دماغوں اور بہت گہرے غور وفکر کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ انسانی فہم و فراست مدارج کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتی، بلکہ متفاوت ہوتی ہے۔

چنانچہ امت میں فہمِ حدیث کے حوالے سے پائے جانے والے زاویہ ہاے نظر کا جائزہ لیا جائے تو آرا کے جزوی اختلاف سے قطعِ نظر، اصولی طور پر دو متوازی مکتبِ فکر سامنے آتے ہیں جو فہمِ حدیث کے باب میں اپنے اصولی طریقۂ کار اور اندازِ نظر کے حوالے سے بالکل مختلف خصائص کے حامل ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جس کے نزدیک حدیث کے فہم میں اس کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس مجموعی نظام کی رعایت بھی ضروری ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے۔ ان کے نزدیک احکام کا مدار حدیث میں بیان کردہ ظاہری صورت پر نہیں، بلکہ اس کی علت پر ہوتا ہے، اس لیے اگر علت بدل جائے تو ان کے نزدیک ظاہری شکل کی مماثلت کے باوجود حکم بدل جائے گا۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں حدیث کا مفہوم متعین کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت اور دوسری حیثیات میں بھی فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس طرزِ فکر کے نمائندہ امت کے فقہی مکاتبِ فکر میں احناف اور مالکیہ ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کے نزدیک فہمِ حدیث کا بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو، حدیث کے ظاہر کی اتباع اور آخری حد تک اس کے الفاظ کی رعایت کی جائے۔ یہ طبقہ محدثین کا ہے جس کی نمائندگی فقہی مکاتبِ فکر میں شوافع اور حنابلہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے طریقے میں امام داؤد ظاہری کی طرح ظاہرِ حدیث کی اتباع میں حدِ اعتدال سے بہت زیادہ تجاوز نہیں ہے اور اصولی طور پر احکام کی علت و حکمت کا لحاظ رکھنا ان کے ہاں مسلم ہے، تاہم عملاً الفاظ کی ہر ممکن حد تک رعایت اس طریقۂ فکر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں احادیث کی تشریح ایک مربوط نظام کے اجزا کی حیثیت سے نہیں، بلکہ بیشتر ان کی انفرادی حیثیت میں کی جاتی ہے، اور حدیث کی لفظی دلالت کے علاوہ دیگر خارجی اصولوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ اگر کسی مسئلے میں حنفیہ یا مالکیہ یہ کہیں کہ فلاں حدیث یا اس کا یہ مفہوم شریعت کے اصول کلیہ کے خلاف ہے تو وہ خطابی کے الفاظ میں کہتے ہیں:

والاصل ان الحدیث اذا ثبت عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وجب القول بہ وصار اصلا فی نفسہ۔	''اصول یہ ہے کہ حدیث جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے اور وہ بذاتِ خود ایک اصل بن جاتی ہے۔[1]''

ان دونوں رجحانات کی جھلک خود حضرات صحابۂ کرام کے ہاں ملتی ہے۔ چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ابوہریرہ نے یہ حدیث بیان کی کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ عبداللہ ابن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا: ''کیا ہم چکناہٹ سے وضو کریں؟ کیا ہم گرم پانی کے استعمال سے وضو کریں؟'' (مراد یہ تھی کہ

---

[1] الخطابی، معالم السنن، ج۳، ص۱۱۳۔

یہ کوئی واجب حکم نہیں ہے، کیونکہ خلافِ قیاس ہے اور یا یہ کہ ابو ہریرہ کو سننے یا سمجھنے میں غلطی لگی ہے)۔اس پر حضرت ابو ہریرہ نے کہا: ''جب تمھارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی جائے تو باتیں نہ بنایا کرو''[2]۔

۲۔موطا امام مالک میں روایت ہے کہ حضرت معاویہ نے سونے یا چاندی کے کچھ برتن فروخت کیے اور بدلے میں ان کے وزن سے زیادہ سونا یا چاندی وصول کی۔ جب حضرت ابوالدرداء نے انھیں بتایا کہ اس بیع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے تو اُنھوں نے جواب دیا: ''میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔'' (مراد غالباً یہ تھی کہ ابوالدرداء کو حکم سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے یا یہ کہ ممانعت کی علت اس صورت میں نہیں پائی جاتی)۔ابوالدرداء نے یہ سنا تو پکارے: ''کون ہے جو مجھے معاویہ کے شر سے بچائے؟ میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سناتا ہوں اور وہ مجھے اپنی رائے بتاتا ہے''[3]۔

۳۔عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا استاذنکم نساؤکم باللیل الی المسجد فاذنوا لھن۔ ''اگر تمھاری عورتیں رات کے وقت مسجد میں جانے کی اجازت مانگیں تو انھیں مت روکا کرو''[4]۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ عورتوں نے جو طور طریقے اب اختیار کر لیے ہیں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کرتیں تو آپ انھیں مسجد میں آنے سے منع فرما دیتے[5]۔لیکن عبداللہ ابن عمر کے بیٹے بلال نے اپنے والد کے سامنے کہا کہ ہم عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکیں گے تو وہ سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سناتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ہم انھیں روکیں گے[6]؟

ان دونوں طریقوں میں سے کسی کا محرک جیسا کہ واضح ہے، نفسانیت کا جذبہ نہیں، بلکہ پیغمبر کے منشا کا صحیح ادراک اور اس کی اتباع تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر ان دونوں طریقوں کی خاموش تصویب بھی فرمائی۔

حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خندق سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آئے تو آپ نے فوری طور پر بنوقریظہ کی طرف چلنے کا حکم دیا اور کہا کہ بنوقریظہ میں پہنچنے سے قبل کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے۔بعض صحابہ ابھی راستے ہی میں تھے کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور ان میں رائے کا اختلاف ہو گیا۔ایک گروہ نے کہا کہ چونکہ ہمیں بنوقریظہ میں پہنچنے سے پہلے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، اس لیے ہم نماز نہیں پڑھیں گے۔ جب کہ دوسرے گروہ نے یہ کہہ کر نماز

۲۔ جامع الترمذی، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء مما غیرت النار، حدیث نمبر ۷۹۔

۳۔ الموطا لمالک، باب بیع الذہب بالورق عینا وتبرا، ص ۵۸۲۔

۴۔ بخاری، کتاب الاذان، باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس، حدیث ۸۶۴۔

۵۔ بخاری، کتاب الاذان، باب انتظار الناس قیام الامام العالم، حدیث ۸۶۹۔

۶۔ بخاری، کتاب الاذان، باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس، حدیث ۸۶۴۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پڑھ لی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ نہیں تھا، (بلکہ یہ تھا کہ ہم تیزی سے چلیں اور عصر سے پہلے بنو قریظہ میں پہنچ جائیں)۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ بعد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا ذکر کیا گیا تو آپ نے دونوں گروہوں میں سے کسی کو نہیں ڈانٹا۔[7]

تاہم جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک فہمِ حدیث کا کون سا طریقہ زیادہ پسندیدہ تھا اور آپ کے فقہا صحابہ نے کس طریقے کی پیروی کی تو آیئے اس کو جاننے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہا صحابہ کی آرا کا مطالعہ کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات

روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فہم حدیث کے حوالے سے صحابہ کو دو بنیادی باتوں کی تعلیم دی۔

ایک یہ کہ آپ کے ان احکامات میں جو آپ نے بحیثیتِ پیغمبر ارشاد فرمائے ہیں اور ان ہدایات میں جن کی بنیاد عقلِ عام یا تجربہ یا ذاتی پسند و ناپسند پر ہے، فرق ملحوظ رکھا جائے۔ پہلی صورت میں آپ کے احکام کی اتباع لازم ہے اور اس میں کسی کو کوئی اختیار نہیں، جبکہ دوسری صورت میں امت کے لیے عقل و رائے کا استعمال ممنوع نہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن کی چند روایتیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ کھجور کے درختوں کو گابھا دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید پھل زیادہ اچھا ہو۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا، لیکن پھل پہلے سے کم ہوا۔ لوگوں نے آپ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:

انما انا بشر، اذا امرتکم بشئی من دینکم فخذوا به، و اذا امرتکم بشئی من رایی فانما انا بشر ۔	”میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔ جب میں تمھیں دین کے معاملے میں کوئی حکم دوں تو اس پر لازماً عمل کرو، لیکن اگر میں اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو میں بھی ایک انسان ہوں۔[8]“

۲۔ عبد اللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ جب رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

۷؎ بخاری، ابواب صلاۃ الخوف، باب صلاة الطالب و المطلوب راکبا و ایماء، حدیث ۹۴۷۔

۸؎ مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا، حدیث ۶۱۲۷۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس کو کفن دینے کے لیے اپنی قمیص عطا کی۔ پھر جب اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت عمر نے آپ کو کھینچا اور کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقوں کی نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا؟ رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے اس معاملے میں اختیار دیا گیا ہے۔ پھر آپ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔[9]

مذکورہ دونوں واقعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا تعلق دینی پہلو رکھنے والے معاملات سے تھا، لیکن سیدنا عمر نے یہ سمجھ کر کہ آپ کی رائے کا تعلق وحی سے نہیں، بلکہ تدبیر سے ہے، آپ کی رائے کے خلاف رائے دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی۔

۳۔ عبد اللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ جب حضرت عائشہ نے اپنی لونڈی بریرہ کو آزاد کیا تو اس نے اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خاوند مغیث سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا، جس پر مغیث نہایت غمگین تھے۔ بریرہ کے ساتھ مغیث کی محبت کو دیکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے کہا، اگر تم اس کے نکاح میں رہو تو بہتر ہے۔ بریرہ نے پوچھا: یا رسول اللہ کیا یہ آپ کا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں میں بس سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے کہا: تو پھر مجھے مغیث کی کوئی ضرورت نہیں۔[10]

۴۔ حضرت خالد بن الولید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر گوہ کا گوشت پیش کیا گیا، لیکن آپ نے اسے کھانے سے گریز کیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، لیکن چونکہ یہ ہمارے علاقے میں نہیں پائی جاتی تھی، اس لیے اس کا کھانا میرے لیے طبعاً ناگوار ہے۔ چنانچہ حضرت خالد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گوہ کا گوشت کھایا۔[11]

مذکورہ دونوں روایتوں سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی کو ذاتی حیثیت میں کوئی مشورہ دیں یا اپنی طبیعت کی بنا پر کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کریں تو امت پر اس کی اتباع واجب نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ آپ نے صحابہ میں یہ مزاج پیدا کیا کہ وہ آپ کے احکام کی علت اور ان کا معنی و غرض سمجھنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی دینی یا دنیاوی حکم دیتے ہوئے بالعموم اس کی حکمت اور فائدہ بھی بیان فرما دیتے تھے اور اگر کسی موقع پر صحابہ کی نظر حکم کی علت اور حکمت سے ہٹ جاتی تو آپ ان کی توجہ اس کی طرف مبذول کرا دیتے۔

۱۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک جماعت مہمان بن کر مدینہ منورہ میں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ قربانی کا گوشت صرف تین دن کے لیے ذخیرہ کرو، باقی سب صدقہ کر دو۔

۹۔ بخاری، کتاب الجنائز، باب الکفن فی القمیص الذی یکف او لا یکف، حدیث ۹۹۔

۱۰۔ بخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی فی زوج بریرة، حدیث ۵۲۸۳۔

۱۱۔ ابوداؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الضب، حدیث ۳۷۹۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کچھ وقت گزرنے کے بعد لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ، ہم تو اپنی قربانی کے جانوروں سے بہت سے فائدے اٹھاتے تھے۔ان کی چربی پگھلا کر رکھ لیتے تھے اوران کے چمڑے سے پانی پینے کے برتن بنا لیتے تھے۔ آپ نے فرمایا، تو اب کیا ہوا؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ، آپ نے خود ہی تو منع فرمایا تھا کہ تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت ذخیرہ نہ کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھئی وہ تو میں نے اس جماعت کی وجہ سے منع کیا تھا جو مہمان بن کر تمھارے پاس آئی تھی۔تم قربانی کا گوشت کھاؤ بھی، صدقہ بھی کرو اور ذخیرہ بھی کرو[۱۲]۔

۲۔ حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک موقع پر نماز کی امامت کرا رہے تھے کہ دورانِ نماز میں آپ نے جوتے اتار کر اپنے بائیں طرف رکھ دیے۔ پیچھے نماز پڑھنے والے صحابہ نے بھی آپ کو دیکھ کر اپنے جوتے اتار دیے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں سے پوچھا کہ تم نے کس وجہ سے جوتے اتارے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے آپ کی طرف دیکھ کر ایسا کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تو جبریل نے آ کر بتایا تھا کہ میرے جوتوں میں گندگی لگی ہوئی ہے[۱۳]۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے یہ سوال کرنا کہ ''تم نے کیوں جوتے اتارے؟'' اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کے ہر ہر عمل کی اتباع لازم نہیں، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ کے کسی فعل کی نوعیت کیا ہے اوراس کی پیروی امت سے مطلوب ہے یا نہیں۔

۳۔ عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من جر ثوبه خيلاء لا ينظر الله اليه يوم القيامة ـ	''جس شخص نے تکبر کرتے ہوئے اپنا کپڑا زمین پر کھینچا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نگاہ رحمت نہیں کریں گے۔''

حضرت صدیق اکبر نے عرض کی کہ یا رسول اللہ، میری چادر کا ایک کنارا تو ڈھلکا ہی رہتا ہے، الا یہ کہ میں ہر وقت اسے پکڑے رکھوں۔ آپ نے فرمایا: تم تکبر کی وجہ سے تو ایسا نہیں کرتے، (اس لیے تم پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا[۱۴])۔

۴۔ غالب ابن ابجر کہتے ہیں کہ ہم قحط کا شکار ہو گئے اور گدھوں کے سوا ہمارے پاس خوراک کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتِ حال عرض کی اور کہا کہ آپ نے تو گدھوں کا گوشت حرام قرار دے رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا، اپنے گھر والوں کو کسی موٹے تازے گدھے کا گوشت کھلاؤ۔ میں نے تو ان گدھوں کی وجہ سے ان کو حرام کیا جو بستی میں گھومتے پھرتے گندگی کھاتے رہتے ہیں[۱۵]۔

۱۲؎ ابوداؤد، کتاب الضحایا، باب حبس لحوم الاضاحی، حدیث ۲۸۱۲۔

۱۳؎ ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الصلاة فی النعل، حدیث ۶۵۰۔

۱۴؎ بخاری، کتاب اللباس، باب من جر ازاره من غير خيلاء، حدیث ۵۷۸۴۔

اس تربیت کے نتیجہ میں صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف احکام کی حکمت دریافت بھی کرتے تھے اور بہت سے مواقع پر اس حوالے سے اپنی آرا بھی آپ کے سامنے پیش کرتے تھے جنھیں آپ قبول کر لیتے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ سلمہ بن الاکوع روایت کرتے ہیں کہ خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آگ پر کچھ ہانڈیاں چڑھی ہوئی ہیں تو پوچھا کہ ان میں کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ گھریلو گدھوں کا گوشت ہے۔ آپ نے فرمایا: ان کو توڑ دو اور گوشت پھینک دو۔ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ، کیا ہم ایسا نہ کر لیں کہ گوشت تو پھینک دیں اور ہانڈیوں کو دھو لیں؟ آپ نے فرمایا، چلو ایسا کر لو۔[۱۶]

۲۔ ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: راستوں پر مت بیٹھا کرو۔ صحابہ نے کہا، ہمارے لیے تو اس کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ ہماری گفتگو کی مجلسیں ان راستوں ہی میں جمتی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا تو پھر جب تم ایسی مجلسیں جماؤ تو راستے کا حق ادا کیا کرو۔ صحابہ نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: آنکھ کی حفاظت، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، نیک بات کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا۔[۱۷]

۳۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ان سے کہا، اے ابوہریرہ، میرے یہ دونوں چپل گواہی کے لیے ساتھ لے جاؤ اور جو شخص بھی ایسا ملے جو دل کے یقین سے یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو اسے جنت کی خوش خبری سنا دو۔ ابوہریرہ جب چلے تو سب سے پہلے حضرت عمر سے ملاقات ہوگئی۔ ابوہریرہ نے جب انھیں یہ بات بتائی تو انھوں نے ابوہریرہ کو زور سے دھکا دیا جس سے وہ پیٹھ کے بل گر گئے، اور ان سے کہا کہ واپس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو۔ جب دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور ابوہریرہ نے شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی۔ حضرت عمر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، آپ لوگوں کو یہ خوش خبری نہ سنائیں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ اس سے لوگ عمل کی جانب سے بے پروا ہو جائیں گے۔ آپ انھیں عمل کرتے رہنے دیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اچھا ٹھیک ہے، ان کو عمل کرتے رہنے دو۔[۱۸]

ان اصولوں کو سمجھنے اور ان کو برتنے کی تربیت جن صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پائی، ان کی آرا میں ان اصولوں کا لحاظ نہایت واضح طور پر ملتا ہے۔

۱۵؎ ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی اکل لحوم الحمر الاھلیۃ، حدیث ۳۸۰۹۔

۱۶؎ بخاری، کتاب المظالم، باب ھل تکسر الدنان التی فیھا الخمر او تخرق الدقاق؟، حدیث ۲۴۷۷۔

۱۷؎ بخاری، کتاب المظالم، باب افنیۃ الدور والجلوس فیھا، حدیث ۲۴۶۵۔

۱۸؎ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ن من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعا، حدیث ۲۸۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

صحابہ اور فہم حدیث

عقل و قیاس کی رعایت

O عبداللہ ابن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد پر باپ کا حق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

انت و مالك لوالدك، ان اولادكم من اطيب كسبكم فكلوا من كسب اولادكم۔ ''تم اور تمھارا مال اپنے باپ ہی کے ہو۔ بے شک تمھاری اولاد بھی تمہاری کمائی میں سے ہے، اس لیے تم اپنی اولاد کے کمائے ہوئے مال میں سے کھا سکتے ہو۔''[19]

O حضرت صدیقِ اکبر کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور کہا کہ میرا باپ میرا سارا مال اپنی کسی حاجت کے لیے لے لینا چاہتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے اس کے باپ سے کہا: تم اس کے مال میں سے بقدر ضرورت ہی لے سکتے ہو، سارا مال نہیں۔ اس نے کہا: اے خلیفۂ رسول، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ تم اور تمھارا مال اپنے باپ ہی کے ہو؟ آپ نے فرمایا، ہاں لیکن اس سے آپ کی مراد باپ کا ضروری نفقہ ہے، اس لیے اسی چیز پر راضی رہو جس پر اللہ راضی ہے۔[20]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کلام کے پس منظر کی رعایت

O حضرت عبداللہ ابن عمر نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الشهر تسع وعشرون۔ ''مہینا انتیس دن کا ہوتا ہے۔''

حضرت عائشہ کو علم ہوا تو فرمایا، اللہ ابن عمر پر رحم کرے، اصل بات یوں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینے تک اپنی ازواج سے الگ رہنے کی قسم کھائی تھی، لیکن آپ انتیس دن کے بعد ہی گھر واپس تشریف لائے۔ لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ، آپ نے تو ایک مہینے کی قسم کھائی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ مہینا انتیس دن کا بھی تو ہو سکتا ہے۔[21]

O حضرت عائشہ کو علم ہوا کہ حضرت ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تین حدیثیں بیان کرتے ہیں:

(۱) لان امتع بسوط في سبيل الله احب ''اللہ کے راستے میں ایک چھڑی دے دینا مجھے کسی

---

۱۹ ابوداؤد، کتاب البیوع، باب الرجل یاکل من مال ولده، حدیث ۳۵۳۰۔

۲۰ البیہقی: السنن الکبری، ج ۷، ص ۴۸۱۔

۲۱ الامام احمد: المسند، مسند المکثرین من الصحابة، حدیث ۴۶۳۴۔

الی من ان اعتق ولد الزنا۔ ولدالزنا کوآزاد کرنے سے زیادہ پسند ہے۔‘‘

(۲)ولد الزنا شر الثلاثۃ۔ ’’ولدالزنااپنے ماں باپ دونوں سے بدتر ہے۔‘‘

(۳) ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ۔ ’’پس ماندگان کے رونے سے مردہ کوعذاب ہوتا ہے۔‘‘

حضرت عائشہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو ہریرہ پر رحم کرے، انھوں نے سننے میں بھی غلطی کی اور آگے بتانے میں بھی۔ آپ کے پہلے ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جب یہ آیت اتری کہ: ’فلا اقتحم العقبة وما ادراك ما العقبة فك رقبة‘ (انسان گھاٹی پر نہ چڑھا۔ اور تجھے کس نے بتایا کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی غلام کو آزاد کرانا)۔ تو بعض لوگ جن کے پاس آزاد کرنے کے لیے غلام نہیں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ کیا ہم ایسا نہ کریں کہ اپنی لونڈیوں سے زنا کرائیں اور پھر جن بچوں کو وہ جنم دیں، انھیں آزاد کر دیں؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں ایک چھڑی دے دینا مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ میں زنا کا حکم دوں اور پھر بچے کو آزاد کر دوں۔ آپ کے دوسرے ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ منافقین میں سے ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تنگ کرتا تھا۔ آپ نے کہا، کون ہے جو مجھے اس کی اذیت سے بچائے؟ لوگوں نے کہا یارسول اللہ وہ شخص تو ویسے بھی ولدالزنا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو اپنے ماں باپ سے بھی بدتر نکلا۔ تیسرے ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی کے گھر میں تشریف لے گئے جس کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے گھر والے رو رہے تھے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ یہ اس پر رو رہے ہیں، جبکہ اس کو اپنی قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔[۲۲]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وقتی مصالح پر مبنی احکام اور تشریع میں فرق

O رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے طریقہ یہ چلا آ رہا تھا کہ جنگوں میں جو بھی مالِ غنیمت نقدی یا زمینوں کی شکل میں حاصل ہوتا، اس کا پانچواں حصہ بیت المال کے لیے نکال کر باقی مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا۔ سیدنا عمر کے زمانے میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور ملکوں کے ملک قبضے میں آنے لگے تو انھوں نے اس طریقہ کو ختم کر دیا اور فرمان جاری کیا کہ اب زمینیں تقسیم نہیں کی جائیں گی، بلکہ انھیں بٹائی پر دے کر ان کی آمدن بیت المال کے لیے حاصل کی جائے گی۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

لو لا آخر المسلمين ما فتحت عليهم ’’اگر مجھے بعد میں آنے والے مسلمانوں کا خیال نہ

۲۲؎ الحاکم، ابوعبداللہ النیسابوری: المستدرک، لبنان: دارالمعرفۃ، سن ندارد، ج ۲، ص ۲۱۵۔

قرية الا قسمتها کما قسم النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم خیبر۔ | ہوتا تو میں بھی ہر فتح ہونے والی بستی کی زمینیں اسی طرح تقسیم کر دیتا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینیں کی تھیں[۲۳]۔‘‘

O قرآنِ مجید عربی زبان میں قریش کے لہجے پر نازل ہوا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی سہولت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی خصوصی اجازت حاصل کی کہ ناخواندہ لوگوں کو اپنے اپنے لہجوں پر قرآن پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں اہل عجم کے ساتھ اختلاط کے باعث جب یہی سہولت فتنہ اور اختلافات کا باعث بننے لگی تو صحابۂ کرام نے اجماعی فیصلے کے ساتھ اس سہولت کو ختم کر دیا اور حضرت عثمان نے قریش کے لہجے پر قرآن کے نسخے لکھوا کر ملکوں میں بھجوا دیے اور ان کے سوا تمام نسخے ضبط کر کے جلا دیے[۲۴]۔

O ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم[۲۵]۔ | ’’جمعے کے دن غسل کرنا ہر بالغ آدمی پر واجب ہے۔‘‘

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں۔ یہ حکم آپ نے اس لیے دیا تھا کہ آپ کے زمانے میں مسجد نبوی چھوٹی تھی، لوگ کام کاج کرتے ہوئے اٹھ کر جمعہ کے لیے آجاتے تھے اور انھوں نے سوت کے کپڑے پہنے ہوتے تھے جس سے مسجد میں پسینے کی بدبو پھیل جاتی اور لوگوں کو تکلیف ہوتی۔ اب اللہ تعالیٰ نے مال کی فراوانی دی ہے، لوگ سوت کے کپڑے نہیں پہنتے، مشقت کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی اور مسجد بھی وسیع کر دی گئی ہے، اس لیے اب اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا[۲۶]۔

O عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کرتے یعنی سینہ اکڑاتے ہوئے چلتے تھے[۲۷]۔

حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ سنت نہیں، بلکہ ایک وقتی حکم تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی تو سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے طواف کر ہی نہیں سکیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ

۲۳۔ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر، حدیث ۴۲۳۶۔

۲۴۔ تقی عثمانی: علوم القرآن، کراچی: مکتبہ دارالعلوم، ۱۳۹۶ھ، ص ۱۳۴۔

۲۵۔ بخاری، کتاب الجمعة، باب فضل الغسل یوم الجمعة، حدیث ۸۷۹۔

۲۶۔ ابوداؤد، کتاب الطہارة، باب الرخصة فی ترك الغسل یوم الجمعة، حدیث ۳۵۳۔

۲۷۔ مسلم، کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطواف فی العمرة و فی الطواف الاول فی الحج، حدیث ۳۰۴۸۔

علیہ وسلم نے صحابہ کورمل کا حکم دیا تاکہ مسلمان مضبوط اور باہمت نظر آئیں۔[28]

O حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔[29]

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ آپ نے اس وجہ سے منع کیا تھا کہ کہیں سواری اور بار برداری کے لیے گدھے کم نہ پڑ جائیں۔[30]

قضا اور تشریع میں فرق

O رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیتا تو وہ ایک ہی شمار کی جاتیں۔ حضرت عمر نے جب دیکھا کہ لوگ اس معاملہ میں جری ہو گئے ہیں تو حکم جاری کیا کہ اب جو شخص اکٹھی تین طلاقیں دے گا، وہ اس پر نافذ کر دی جائیں گی۔[31]

O رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں اگر کوئی شخص شراب نوشی کے جرم میں پکڑ کر لایا جاتا تو مجلس میں موجود لوگ اپنے ہاتھوں، جوتوں اور چادروں سے اس کی مرمت کرتے۔ سیدنا ابوبکر کے زمانے میں شراب نوشی پر چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی اور سیدنا عمر نے اپنی خلافت میں صحابہ کے مشورے سے کوڑوں کی تعداد اسی (۸۰) کر دی۔ لیکن سیدنا علی نے اپنے زمانۂ خلافت میں دوبارہ چالیس کوڑوں کی سزا دینا شروع کر دی۔[32]

O ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صدقۂ فطر میں گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک صاع ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن حضرت معاویہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں شام سے آنے والی گندم کی ایک خاص قسم سمراء کے بارے میں کہا کہ چونکہ معیار یا قیمت کے لحاظ سے اس کا نصف صاع عام گندم کے ایک صاع کے برابر ہے، اس لیے اس سے صدقۂ فطر نصف صاع دیا جائے، چنانچہ لوگوں نے اسی پر عمل کرنا شروع کر دیا، لیکن میں ہمیشہ ایک صاع ہی ادا کرتا رہوں گا۔[33]

O رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین آدمی سیدنا علی کے پاس ایک لونڈی کے بچے کا جھگڑا لے کر آئے جس

۲۸؎ المرجع السابق، حدیث ۳۰۵۵۔

۲۹؎ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر، حدیث ۴۲۱۶۔

۳۰؎ الطبرانی، المعجم الکبیر، ج ۱۱، ص ۳۴۲، حدیث ۱۲۲۲۶۔

۳۱؎ مسلم، کتاب الطلاق، باب طلاق الثلاث، حدیث ۳۶۷۳۔ ۳۶۷۵۔

۳۲؎ بخاری، کتاب الحدود، باب الضرب بالجرید والنعال، حدیث ۶۷۷۹۔ مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر، حدیث ۴۴۵۷۔

۳۳؎ ابوداؤد، کتاب الزکاة، باب کم یودی فی صدقة الفطر، حدیث ۱۶۱۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے ان تینوں نے ایک ہی طہر میں جماع کیا تھا، (اس طرح کہ پہلے ایک شخص کی ملک میں تھی، اس نے جماع کرنے کے بعد دوسرے شخص کو بیچ دی اور اس نے جماع کرنے کے بعد تیسرے شخص کو بیچ دی)، اور ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ بچہ اس کا ہے۔ حضرت علی نے اس کا فیصلہ یوں کیا کہ ان کے درمیان قرعہ ڈالا اور جس آدمی کا نام نکلا، بچہ اس کے حوالے کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔

لیکن بعد میں اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت علی کے پاس جب اسی نوعیت کا ایک اور مقدمہ آیا تو انھوں نے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے کے بجائے بچے کو دونوں میں مشترک قرار دیا۔[۳۴]

تشریع اور امور عادیہ میں فرق

O حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفرِ حج کے موقع پر وادی محصب میں بھی ٹھہرے تھے۔[۳۵]

حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس جگہ ٹھہرنا کوئی سنت نہیں ہے، آپ یہاں بس ایسے ہی ٹھہرے تھے جیسے سفر میں آدمی کسی جگہ ٹھہر جاتا ہے۔[۳۶]

O تفسیر ابن جریر میں روایت ہے کہ حضرت عمر ایک سفر میں روحاء کے مقام پر رکے تو دیکھا کہ کچھ لوگوں نے وہاں پڑے ہوئے چند پتھروں کے قریب جا کر نماز پڑھنا شروع کر دی ہے۔ آپ نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہاں نماز پڑھی تھی۔ حضرت عمر نے اس کو ناپسند کیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بس اس لیے نماز پڑھی تھی کہ یہاں سے گزرتے ہوئے اتفاق سے نماز کا وقت آ گیا تھا۔[۳۷]

O حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ پر بیٹھ کر بیت اللہ کا طواف کیا۔[۳۸]

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ کوئی سنت نہیں ہے، بلکہ آپ نے بھیڑ کی وجہ سے ایسا کیا تھا۔[۳۹]

O ابن جریج نے عبداللہ ابن عمر سے پوچھا کہ میں آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ دباغت کی ہوئی کھال کے چپل پہننے اور زرد

---

۳۴ الطحاوی، ابوجعفر احمد بن محمد: شرح معانی الاثار، ملتان: المکتبۃ الامدادیۃ، سن ندارد، ج ۲، ص ۳۸۹، ۳۹۰۔

۳۵ بخاری، کتاب الحج، باب من صلی العصر یوم النفر بالابطح، حدیث ۱۷۶۴۔

۳۶ بخاری، کتاب الحج، باب المحصب، حدیث ۱۷۶۵، ۱۷۶۶۔

۳۷ الطبری، ابن جریر: تفسیر القران العظیم، بیروت: دار الفکر، ج ۱، ص ۳۴۳۔

۳۸ بخاری، کتاب الحج، باب المریض یطوف راکبا، حدیث ۱۶۳۲۔

۳۹ مسلم، کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطواف فی العمرۃ وفی الطواف الاول فی الحج، حدیث ۳۰۵۵۔

رنگ استعمال کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن صحابہ میں سے اور کسی کو میں نے ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ عبداللہ ابن عمر نے فرمایا کہ یہ دونوں کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اس لیے میں بھی انھیں پسند کرتا ہوں[۴۰]۔

اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادی امور کو بعض صحابہ نے اپنے شخصی ذوق کے تحت اختیار کیا، لیکن صحابہ نے عمومی طور پر ان کی اتباع نہیں کی۔

رخصت اور عام حکم میں فرق

O ابوداؤد میں روایت ہے کہ جب حجاب کی آیات اتریں تو حضرت حذیفہ نے اپنے غلام سالم کے بارے میں عرض کیا کہ وہ تو بچپن ہی سے ہمارے گھر میں رہتا ہے اور اگر اس سے بھی پردے کا اہتمام کیا جائے تو بڑی دقت ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کی اہلیہ سے کہا کہ وہ اپنا دودھ سالم کو پلا دیں، اس طرح وہ اس کی رضاعی ماں بن جائیں گی اور اس سے پردہ لازم نہیں رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اس کو عام حکم تسلیم نہیں کرتی تھیں، بلکہ فرماتی تھیں کہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رخصت صرف سالم کے لیے دی ہو اور باقی لوگوں کے لیے ثابت نہ ہو[۴۱]۔

O فاطمہ بنت قیس بیان کرتی ہیں کہ ان کے خاوند نے انھیں تین طلاقیں دے دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ ان کی رہائش کا انتظام اور نفقہ ان کے خاوند کے ذمہ نہیں ہے[۴۲]۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ کوئی عام حکم نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کی مجبوری کی بنا پر اسے یہ رخصت دی تھی، کیونکہ وہ ایک ویران مکان میں رہتی تھی اور اس کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا[۴۳]۔

(باقی)

۴۰؎ بخاری، کتاب الوضوء، باب غسل الرجلین فی النعلین، حدیث ۱۶۶۔

۴۱؎ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب من حرم به، حدیث ۲۰۶۱۔

۴۲؎ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی نفقة المبتوتة، حدیث ۲۲۸۸۔

۴۳؎ بخاری، کتاب الطلاق، باب قصة فاطمة بنت قیس، حدیث ۵۳۲۵۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

ہیئت نماز کی حفاظت

نماز اللہ تعالیٰ کی عبادت کا عظیم مظہر ہے۔ اس میں انسان اپنے اعضا و جوارح کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جسمانی انکسار کے ساتھ مسلمان کا دل بھی عاجزی اور خضوع کے ساتھ اللہ سے مناجات کرتا ہے۔ اس لیے وہ ایسے افعال و اعمال سے گریز کرتا ہے جو نماز کے ظاہر اور اس کی روح کے خلاف ہوں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے جو آدابِ نماز کے منافی ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں تو ایسی ہیں جو خشوع اور توجہ کو منتشر کرتی ہیں۔ جیسے نماز کے اندر اِدھر اُدھر دھیان کرنا یا بالوں، کپڑوں اور داڑھی سے کھیلنا۔ کچھ باتیں نماز کی ہیئت سے متعلق ہیں۔ جیسے دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنا ضروری ہے، اسی طرح نماز کی ہیئت کو درست رکھنا بھی لازمی ہے۔ یہ ہیئت قیام، رکوع، سجدہ اور جلسہ کے بنیادی ارکان پر مشتمل ہے۔

ایک نمازی کا جسم ادائیگیِ نماز کے دوران میں معتدل رہنا چاہیے۔ قیام کے اندر اعتدال کا مطلب ہے کہ دونوں ٹانگوں پر برابر وزن ڈالا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ایک ٹانگ ڈھیلی چھوڑ دی جائے یا دائیں بائیں جھولا جائے۔ رکوع کے اندر اعتدال کمر اور سر کو سیدھا رکھنا ہے اور سجدے کا اعتدال پیٹ کو زمین سے اونچا رکھنا اور ٹانگوں اور بازووں کو پیٹ سے جدا رکھنا ہے، جبکہ ماتھا اور ناک زمین سے لگے ہوں۔ جلسے کا اعتدال بھی ایسے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی کوئی ایسی ہیئت اختیار نہ کی جائے جو نماز کے منافی ہو۔ فقہ کی کتابوں میں ''مکروہاتِ نماز'' کے عنوان کے تحت ایسی تفصیلات مل جاتی ہیں۔

یہاں ہمارے پیشِ نظر اُن احادیث و روایات کا ذکر کرنا ہے جن میں اس ہیئت کے بگڑنے کا بیان ہوا ہے۔ ان میں ایک بات مشترک ہے کہ اس طرح کی شکل اختیار نہ کی جائے جو ایک فرماں بردار بندے کے طریقۂ عبادت کے ناموافق ہو۔

۱۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے مصعب بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کے ساتھ نماز پڑھی اور رکوع کرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر ٹانگوں میں رکھ لیے تو میرے والد نے مجھے منع کیا اور بتایا، پہلے ہم ایسا کیا کرتے تھے، پھر ہمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منع کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ہم رکوع میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھیں۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کے اندر قعدہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں کو موڑ کر رکھے۔(سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ)۔

۳۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ سات اعضا پر سجدہ کریں، پیشانی، دو ہاتھ، دو گھٹنے اور دو پاؤں۔یعنی یہ سات اعضا سجدہ کرتے ہوئے زمین پر ٹکے ہوں۔ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کرتے ہوئے پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھا۔(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔

۴۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سجدہ کرنے میں اعتدال سے کام لو۔تم میں سے کوئی بازو لمبے نہ بچھالے جیسے کتا بازو بچھاتا ہے۔آپ کے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اگر بازووں کو زمین پر بچھا لیا جائے تو بیٹھے ہوئے کتے سے مماثلت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ایک نمازی کے لیے موزوں نہیں۔(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔

ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کرتے ہوئے بازووں کو نہ پھیلا کر بچھایا اور نہ اکٹھا کر کے پہلووں سے چپکا لیا۔(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)۔سنن ابوداؤد اور سنن ترمذی میں ہے کہ کچھ صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سجدہ کرنے میں دشواری کی شکایت کی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھٹنوں کی مدد لے لیا کرو۔(کتاب الصلوٰۃ)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۔حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتیں کرنے کی تلقین فرمائی اور تین باتیں کرنے سے روکا۔آپ نے نصیحت فرمائی کہ میں ہر روز چاشت کے دو نفل پڑھوں، سونے سے قبل وتر پڑھ لیا کروں اور ہر ماہ تین نفلی روزے رکھوں۔آپ نے منع فرمایا کہ اس طرح ٹھونگا مار کر سجدہ کروں جیسے مرغ ٹھونگا مار کر زمین سے دانا چگتا ہے، اس طرح نماز میں بیٹھوں جس طرح کتا ٹانگیں کھڑی کر کے سرینوں پر بیٹھ جاتا ہے اور بازووں کو زمین پر ایسے بچھالوں جیسے لومڑ بچھاتا ہے۔(مسند احمد، مسند ابوہریرہ)۔

پہلی حدیث میں سجدے میں زمین پر بازو بچھانے کو کتے کے بیٹھنے سے مشابہ قرار دیا، جبکہ اس حدیث میں اسی عمل کے لیے (لومڑ کی مثال) 'إفتراش الثعلب' (لومڑ کا بیٹھنا) بیان فرمائی۔سنن نسائی میں 'افتراش السبع' (درندے کا بیٹھنا) کے الفاظ ہیں۔(باب التطبیق)۔البتہ جلسے میں ٹانگیں کھڑی کر کے سرینوں پر بیٹھنے کو 'إقعاء الکلب' (کتے کے بیٹھنے) سے تشبیہ دی۔مسند احمد میں 'اقعاء القرد' (بندر کا بیٹھنا) فرمایا گیا۔(مسند ابوہریرہ)۔صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد میں اس وضع کو 'عُقبة الشیطان' (شیطان کی نشانی، شیطان کا سرینوں کو ایڑیوں پر رکھ کر بیٹھنا) قرار دیا گیا ہے۔

۶۔مسند احمد، مسند ابوہریرہ والی حدیث میں جلدی جلدی سجدہ کرنے کو 'نقرة الدیك' (مرغ کے ٹھونگے) کے مانند قرار دیا۔صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ یہ منافق کی نشانی ہے کہ وہ سورج کے ڈوبنے کا انتظار کرتا

ہے جب بالکل ڈوبنے پر آتا ہے تو جلدی جلدی کھڑا ہوتا ہے اور چار ٹھونگے مار کر فارغ ہو جاتا ہے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔ (کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ)۔ سنن ابوداؤد اور سنن نسائی میں اسے 'نقرۃ الغراب' (کوے کا ٹھونگا) قرار دیا گیا ہے۔

۷۔ حضرت وائل بن حجر بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، جب وہ سجدہ کرتے تو گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم کے علاوہ سب صحاح میں مذکور ہے۔ جمہور فقہا نے اسی پر عمل کو بہتر سمجھا ہے، البتہ اوزاعی مالک اور ابنِ حزم نے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھنے کو ترجیح دی ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو ایسے نہ بیٹھو جیسے اونٹ بیٹھتا ہے، بلکہ تم ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھو۔ (مسند احمد، سنن ابوداؤد، سنن نسائی)۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ اونٹ پہلے اپنے گھٹنے زمین پر ٹکاتا ہے تب اگلے قدم زمین پر رکھتا ہے۔ آپ نے اس کی مشابہت سے بچنے کا حکم فرمایا۔

۸۔ زیاد بن صبیح بتاتے ہیں، میں نے حضرت عبداللہ بن عمر کے ساتھ نماز پڑھی اور ہاتھوں کو پہلوؤں پر رکھ لیا۔ جب فارغ ہوئے تو انھوں نے فرمایا اسے 'الصلب' کہتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرماتے تھے۔ (سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح)۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ وضع سولی پر لٹکائے ہوئے شخص سے مماثلت رکھتی ہے۔ جب اس کے بازوؤں کو سولی کے اطراف سے باندھ دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہود ایسا کیا کرتے تھے۔

۹۔ باجماعت نماز، نماز کی بہترین ہیئت ہے، کیونکہ اس میں اجتماعی ڈسپلن اور نظم وضبط کا بہترین مظاہرہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات صف کا اہتمام رکھنا ہے۔ پھر امام کی پیروی کا خیال رکھنا ہے۔ احادیث میں ان باتوں کی بڑی تاکید آئی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم فرشتوں کی طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جیسا کہ وہ اپنے رب کے حضور کرتے ہیں۔ وہ اگلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صفوں میں جڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ (کتاب الصلوٰۃ)۔ حضرت ابومسعود انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور نماز کے وقت ہمارے کندھوں کو چھوتے اور فرماتے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور آگے پیچھے نہ ہو مبادا تمھارے دل بھی ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں۔ تم میں سے زیادہ سمجھ دار میرے قریب کھڑے ہوں، پھر ان سے کم تر، پھر ان سے کم تر۔ (مسلم، کتاب الصلوٰۃ)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ بیمار ہوئے ہم نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، جب کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر مکبّر تھے۔ جب آپ نے ہمیں کھڑے دیکھا تو بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا: تم ایرانیوں اور رومیوں والا کام کر رہے تھے۔ وہ اپنے مسند نشین بادشاہوں کے حضور کھڑے رہتے ہیں۔ ایسا نہ کرنا! اپنے ائمہ کی پیروی کرنا۔ امام کھڑا ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو جاؤ۔ اگر وہ بیٹھا ہو تو تم بھی بیٹھ جاؤ۔ (مسلم، کتاب الصلوٰۃ)۔ حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی بستی یا دیہات میں تین آدمی ہوں اور ان کی جانب سے جماعت کا اہتمام نہ ہو تو ان پر شیطان غلبہ پا لیتا ہے، لہٰذا جماعت کو

www.javedahmadghamidi.com / www.al-mawrid.org

اختیار کرو۔ بلاشبہ بھیڑیا اکیلی بکری کو کھا جاتا ہے۔(سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ)۔ جمعہ کی نماز باجماعت نماز کی وسیع تر ہیئت ہے۔اس کے احکام اوراس کی فضیلتیں اپنی جگہ الگ تفصیل کا تقاضا کرتی ہیں۔

نماز کی روح بندے کا اپنے رب سے عاجزی وانکساری کے ساتھ ہم کلام ہونا ہے۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو نماز کی تکمیل ہو جاتی ہے،لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کے مطابق نماز کی تشکیل نہ کر لی جائے۔ یہ تشکیل اور ہیئت نماز کے عباداتِ معلومہ ہونے کا پتا دیتی ہےاور نماز کی پہچان اسی وضع قطع سے ہوتی ہے۔اس قالب کو اختیار کیے بغیر نماز کا باطن حاصل نہیں ہوسکتا۔ہمیں اس شکل و ہیئت کو اختیار کرتے ہوئے نماز کی روح اپنے سینوں میں پیدا کرنی ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

احسان الرحمٰن غوری

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار

(Dead Sea Scrolls)

(۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسینیوں کا تعارف، عقائد اور متون بائبل کے علاوہ ان کی دیگر تحریریں

اسینیوں کا تعارف اور عقائد

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کے تعارف کے بعد ہماری گفتگو کا موضوع وہ آبادی یا معاشرہ (کمیونٹی) ہے، جس نے ان دستاویزات کو لکھ کر محفوظ کیا۔ یہ کمیونٹی بحیرۂ مردار کے شمال مغربی حصے میں واقع وادیِ قمران میں آباد تھی۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کی قوم سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہودیوں کے مروج عقائد سے ہٹ کر ایک علیحدہ فرقے کی صورت میں اس وادی میں مقیم تھے۔ دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کی دریافت سے پہلے اس فرقے سے متعلق اہم معلومات پہلی صدی عیسوی کے مشہور مؤرخین جوزیفس[1] (Josephus)، فیلو[2] (Philo)، اور پلائنی[3] (Pliny) کی تحریروں ہی میں ملتی تھیں۔ جبکہ کوئی بلاواسطہ ماخذ ابھی

---

[1] جوزیفس پہلی صدی کا ایک یہودی مؤرخ تھا۔ اس نے دوسری صدی ق م اور پہلی صدی عیسوی کے دوران میں یہودیوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کے متعلق اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ جوزیفس تقریباً ۳۷ عیسوی میں یروشلم میں پیدا ہوا اور ۱۰۰ عیسوی میں وفات پائی۔ اس کا اصل نام یوسف بن متتیاہو (Yosef Ben Mattityahu) تھا۔ جوزیفس کی صرف چار ہی کتب اب دستیاب ہیں۔

[2] فیلو آف اسکندریہ پہلی صدی عیسوی کا ایک مشہور مؤرخ تھا۔ فیلو تقریباً ۱۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۵۰ عیسوی میں وفات پائی۔ فیلو نے یہودیوں خصوصاً اسکندریہ میں مقیم یونانی بولنے والے یہودیوں کی تاریخ رقم کی جو تقریباً دوسری صدی ق م سے پہلی صدی عیسوی کے

تک موجود نہ تھا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کو لکھنے والے دراصل یہی اسینی تھے۔ زیادہ تر علما (مثلاً ایف۔ ایم۔ کراس، ایف۔ ایف۔ بروس۔ جی۔ وورمیز وغیرہ[۴]) کا موقف یہ ہے کہ اسینی ہی وہ قوم تھی جو قمران میں رہائش پزیر تھی اور اُنھی نے ان دستاویزات کو تحریر کیا تھا۔ پھر کسی ناگزیر ضرورت کی بنا پر انھوں نے ان تحریروں کو غاروں میں محفوظ کر دیا۔ نظر ثانی شدہ ہیسٹنگز ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے:

> "The nature of their life and organization and the location of their settlement make it natural to identify them with the Essenes, described by Josephus and Philo. They were at least a closely related sect, part of the same general movement.[۵]"

عورتوں سے احتراز اور تجرد اس فرقے کی ایک اہم خصوصیت بیان کی جاتی رہی ہے۔ تمام مورخین کے کام اور دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کے مطالعہ سے یہی تاثر سب سے پہلے قارئین کے ذہنوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ سوال بھی ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شادی سے احتراز کے باوجود ان کی نسل تقریباً دو، اڑھائی سو سال تک کیسے چلی؟ اس سوال کا ایک جواب تو پلائنی اور فیلو نے یہ دیا ہے کہ اس معاشرے میں شامل ہونے والے افراد کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ لوگ دوسرے علاقوں سے یہاں آ کر آباد ہو جاتے اور اس معاشرے کا حصہ بن جاتے۔ اس کے علاوہ بعض افراد اپنے بچوں کو خصوصی طور پر بھی اس معاشرے میں تربیت کی غرض سے بھیج دیتے تھے۔ اور بعض بچوں کو متبنّٰی بنا لیتے اور پھر انھیں اپنے زیرِ نگرانی اس طریقے سے پرورش کرتے کہ یہ بچے بھی سختی سے انھی کے عقائد پر عمل درآمد کرنے لگتے۔ اس کے علاوہ جوزیفس نے اس کمیونٹی میں شادی کے رواج کا بھی ذکر کیا ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے، جسے عطاء الرحیم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ حضرت یحیٰی علیہ السلام کی پرورش

دوران میں یہاں آباد ہوئے تھے۔

۳؎ پلائنی بھی پہلی صدی عیسوی کا ایک مؤرخ ہے۔ اس نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل اور بعد کی صدی کے اہم واقعات کو قلم بند کیا۔

۴؎ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

- ***Encyclopedia Judaica,*** under Entry "**Essenes**".
- ***Hasting's Dictionary of the Bible,*** One Vol. Revised Ed., p. 205.
- G.Vermes, ***The Dead Sea Scrolls in English,*** 4th Ed. pp. 21-22.
- F.Bruce, ***Second Thoughts on the Dead Sea Scrolls,*** p. 119.
- F.M.Cross, ***Ancient Library of the Qumran and Modern Biblical Studies,*** p. 51.
- ***Pictorial Biblical Encyclopedia***, p.254.

۵؎ ***Hasting's Dictionary of the Bible,*** One Vol. Revised Ed., p. 205.

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

بھی اسی کمیونٹی میں ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"The Essenes, as we already know from Pliny's record, disdained marriage, but they adopted other men's children while yet pliable and docile, accepting them as their kin and moulding them according to their way of life. Thus, through centuries, incredible though it seems, the Essene society had perpetuated itself, although no one was ever born into it. Thus, Zachariah, the high Priest in the Temple of Solomon, when he had a son in his old age, sent him to the Essenes in the wilderness where the child was brought up. He is known to history as John the Baptist.

Now that we know that the Essene community did exist in the wilderness, Zachariah's action is made understandable. He was entrusting him to the most reliable of communities, a community which sought to live in a manner pleasing to Jehovah.[٦]"

اس بات کی نشاندہی قرآن میں بھی کی گئی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا ہے کہ:

اَنَّ اللّٰـہَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا م بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔[۷]

''کہ اللہ تجھ کو خوش خبری دیتا ہے یحییٰ کی، جو گواہی دے گا اللہ کے ایک حکم کی اور سردار ہوگا اور عورتوں کے پاس نہ جائے گا۔''[۸]

یہاں 'حصورا' توجہ طلب اصطلاح ہے۔ مفردات القرآن کے مصنف امام راغب 'ح ص ر' کے مادہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

''الحصر'' کے معنی تضیق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ (...) اور آیتِ کریمہ 'و سیداً و حصوراً...' میں 'حصورا' کے معنی عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والا کے ہیں خواہ یہ نامردی کی وجہ سے ہو اور خواہ عفت اور ازالۂ شہوت میں

---

٦ Atta-ur-Rahim, ***Jesus: A Prophet of Islam,*** p. 26-27.

۷ آلِ عمران ۳: ۳۹۔

۸ مترجم: مولانا محمود الحسن، شاہ فہد قرآن پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منوّرہ، ۱۹۸۹ء۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر۔ مگر یہاں دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں کیونکہ یہ لفظ ان (حضرت یحییٰ) کے لیے بطور مدح کے استعمال ہوا ہے[9]۔''

جوزیفس وہ واحد مورخ ہے جس نے اس معاشرے میں شادی کے رواج کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بقول اس معاشرے میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو شادی شدہ تھا۔ اس بات کی تصدیق اس قبرستان سے بھی ہوتی ہے جو قمران کے نواح میں دریافت ہوا۔ ان میں سے بعض قبروں میں عورتوں کے ڈھانچے بھی پائے گئے[10]۔

اسینیوں کے نزدیک شادی کی اصل وجہ لذت کا حصول نہ تھا، بلکہ اپنی نسل کو آگے بڑھانا تھا۔ وہ جس عورت کو شادی کے لیے منتخب کرتے اسے تین سال کے آزمائشی دور سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس آزمائش میں پورا اترنے کے بعد اس سے شادی کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر بروز لکھتے ہیں کہ دستاویزاتِ دمشق میں شادی شدہ لوگوں کے گروہ کا واضح ذکر موجود ہے۔ دستاویزاتِ دمشق اور سماجی ضابطے (Manual of Discipline) میں بھی اسینیوں کے ایک گروہ کا ذکر ملتا ہے، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ عورتوں اور بچوں کے ڈھانچے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو شادی کرتے تھے[11]۔

فیلو (Philo) کے حوالے سے کونی بیئر (F.C.Conybeare) نے ہیسٹنگز ڈکشنری آف دی بائبل کے ایک مقالہ میں اسینیوں کا مختصر تعارف اور ان کے عقائد سے متعلق معلومات کا خلاصہ ان الفاظ میں درج کیا ہے:

"They were a sect of Jews, and lived in Syria Palestine, over 1000 in number, and called Essaei, because of their saintliness; for hosis=saintly, is the same word as Essaeus. Worshippers of God, they yet did not sacrifice animals, regarding a reverent mind as the only true sacrifice. At first they lived in villages and avoided cities, in order to escape the contagion of evils rife therein. They pursued agriculture and other peaceful arts; but accumulated not gold or silver, nor owned mines. No maker of warlike weapon, no huckster or

---

9 **مفردات القرآن**، مادہ 'ح ص ر'، امام راغب اصفہانی، ترجمہ وحواشی، مولانا محمد عبدہ فیروز پوری، اہل حدیث اکادمی، لاہور، ص ۲۳۹۔۲۴۰۔

10 ***The Works of Flavius Josephus,*** p. 600.

11 ***Ibid***.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

trader by land or sea, was to be found among them. Least of all were any slaves found among them; for they saw in slavery a violation of the law of nature, which made all men free brethern, one of the other.

Abstract philosophy and logic they eschewed, except so far as it could subserve ethical truth and practice. Natural Philosophy they only studied so far as it teaches that there is a God who made and watches over all things. Moral philosophy or ethic was their chief preoccupation, and their conduct was regulated by their national (Jewish) laws. These laws they esp. studied on the seventh day, which they held holy, leaving off all work upon it and meeting in their synagogues, as these places of resort were called. In them they sat down in ranks,the older ones above the younger. Then one took and read the Bible, while the rest listened attentively; and another, who was very learned in the Bible, would expound whatever was obscure in the lesson read, explaining most things in their time-honoured fashions by means of symbols. They were taught piety, holiness, justice, the art of regulating home and city, knowledge of what is really good and bad and of what is indifferent, what ends to avoid, what to pursue,---in short, love of God, of virtue, and of man.

(...). For no one had his private house, but shared the dwellings with all; and, living as they did in colonies, they threw open their doors to any of their sect who came their way. They had a storehouse, common expenditure, common raiments, common food eaten in Sissitia or common meals.(...) The aged among them were objects of reverence and honour, and treated by the rest as parents by real children.[12] "

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

”یہ (اسینی) یہودیوں کے ایک فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شام وفلسطین میں آباد تھے۔ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔اور انھیں "Essaei" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ان کی وجہ تسمیہ [دراصل] ان کی برگزیدگی اور پرہیزگاری تھی۔ کیونکہ "Essaeus" اور "hosis" مترادف لفظ ہیں، جن کا مطلب پرہیزگاری ہے۔اس فرقے کے پیروکار خدا کی عبادت کرتے تھے، لیکن جانوروں کو قربان نہیں کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ایک قابلِ احترام اور متقی ذہن ہی اصل قربانی ہے۔ابتدا میں یہ لوگ دیہات میں رہتے تھے اور شہروں میں رہنے سے گریز کرتے تھے، تاکہ وہاں رائج برائیوں کی وبا سے بچا جا سکے۔انھوں نے زراعت اور دوسرے پُرامن فنون اپنا رکھے تھے۔ یہ لوگ سونا، چاندی یا معدنیات کا ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ نہ جنگی ہتھیار بناتے تھے اور نہ ہی خوانچہ فروشی اور سمندری یا زمینی راستوں کے ذریعے سے تجارت کرتے تھے۔ اسینیوں کے ہاں غلاموں کا وجود نہ تھا، کیونکہ وہ کسی کو غلام بنانا قدرت کے قانون کی خلاف ورزی تصور کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ قدرت نے تمام انسانوں کو آزاد پیدا کیا اور ایک دوسرے کے لیے بھائی بھائی بنایا ہے۔

مجرد فلسفے اور منطق کو اسینی سخت ناپسند کرتے تھے، سوائے اس کے کہ یہ اخلاقی سچائیوں اور عمل (صالح) میں ممدو معاون ہو۔مظاہرِ فطرت کا مطالعہ وہ ضرور کرتے، لیکن وہ بھی صرف اس حد تک، جہاں تک یہ اس بات کی تعلیم دے کہ خدا موجود ہے، وہی سب کا خالق ہے، وہی رب العالمین اور سب کا نگہبان ہے۔فلسفۂ اخلاق یا اخلاقیات ہی ان کے فکر کا اولین مرکز ومحور تھا۔ان کا ضابطۂ حیات ان کے قومی (اسرائیلی) قوانین شریعت ہی کے مطابق ترتیب پاتا تھا۔ ہفتے کے ساتویں روز (سبت کے دن) کو وہ متبرک قرار دیتے تھے۔وہ خاص طور پر ان قوانین کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔اس دن اسینی اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے اپنی عبادت گاہوں، جنھیں سائناگوگ، صامعہ یا کنیسہ کہا جاتا تھا، میں جمع ہوتے تھے۔کنیسہ میں حاضری کے وقت وہ ترتیب سے قطاروں میں بیٹھ جاتے تھے، بزرگ اوپر والی جگہ پر اور چھوٹے ان سے نیچے۔اس کے بعد ان میں سے ایک کتابِ مقدس پڑھنا شروع کرتا، جبکہ بقیہ حاضرین اسے بغور سنتے۔ پھر ایک اور شخص، جو بائبل کا بڑا عالم ہوتا تھا، پڑھی جانے والی ان آیات میں سے مشکل اور مبہم مقامات کی وضاحت کرتا تھا۔کتابِ مقدس کی وضاحت کے لیے علاماتی انداز اختیار کیا جاتا تھا جو زمانہ قدیم سے رائج تھا۔اس طرح انھیں نیکی، تقدس، انصاف، گھر اور شہر میں نظم وضبط کے قیام کا فن، خیروشر اور مباحات سے آگاہی، نیز یہ کہ کن مقاصد کی پیروی کی جائے، مختصر یہ کہ خدا، نیکی اور انسان کی محبت کا درس دیا جاتا تھا۔

......کیونکہ کوئی گھر کسی کی ذاتی ملکیت میں نہ تھا، بلکہ کالونیوں کی صورت میں رہتے ہوئے سب اسینیوں کی رہائش گاہیں مشترک تھیں۔اس لیے اگر ان کے پاس کوئی اسینی بھائی آجاتا تو اس کے لیے گھر کے دروازے کھول دیے جاتے تھے۔ان کا ایک گودام، مشترک اخراجات، مشترک ملبوسات اور مشترک کھانا تھا جو ان کے مخصوص اجتماع میں کھایا جاتا تھا۔

۱۲؎ ***Hasting's Dictionary of the Bible,*** (Under Entry "Essenes", by F.C.Conybeare), Vol-1, p. 768.

اسینیوں کے نزدیک زیادہ عمر والا شخص قابلِ عزت و احترام تھا اور باقی سب لوگ اس کے ساتھ ایسے ہی سلوک کرتے تھے جیسا بچے اپنے حقیقی والدین کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔''

اس طرح فیلو کے بقول اس فرقے کو ان کی پاک بازی کی وجہ سے اسینی کہا جاتا۔ ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ یہ لوگ شہری زندگی سے دور بھاگتے تھے۔ ان کے خیال میں شہری زندگی ہی دراصل شیطانی حملوں کا اصل نشانہ تھی۔ ان کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی اور دوسرے پر امن ہنر تھے۔ غلامی سے نفرت کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں غلامی دراصل انسانیت کی توہین ہے۔ فلسفہ سے دور بھاگتے تھے اور صرف وہی فلسفہ پڑھتے جو خدا کی پہچان میں مددگار ہو سکتا تھا۔ ان کی زندگی کا بنیادی محور بائبل ہی تھی۔ پورے دن کے معمولات میں بائبل کا مطالعہ بہت ضروری تھا۔ ان کی تمام اشیا مشترکہ ہوتی تھیں ذاتی ملکیت کا تصور نہ تھا۔

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار میں متون بائبل کے علاوہ اسینیوں کی دیگر تحریریں

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار میں عہد نامۂ قدیم کی مستند اور غیر مستند کتب کے علاوہ ایسی تحریریں بھی دستیاب ہوئی ہیں جو اسینیوں کے عقائد و نظریات اور رہن سہن سے متعلق ہیں۔ ان دستاویزات میں اسینیوں کے اپنے نظریات سے مطابقت رکھنے والی عہد نامۂ قدیم کی تفسیریں، سماجی ضابطہ (Manual of Disipline) اور جنگی ضابطہ (War Scroll) وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں اسینیوں کی ان ذاتی اور گروہی تحریروں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تفسیر حبقوق، (1QpHab)[۱۳] (The Pesharim)[۱۴]

تفاسیر پر مشتمل دستاویزات میں کتابِ حبقوق کی تفسیر سب سے اہم ہے۔ مزامیرِ داؤد کی تفسیر بھی یہاں سے دستیاب ہوئی ہے، تاہم حبقوق کی تفسیر نمایاں طور پر اسینیوں کے عقائد کی نمائندگی کرتی ہے۔

کتابِ حبقوق کی تفسیر پر مشتمل طومار (1Qp Hab) پہلے غار سے دستیاب ہوا۔ اس کے تیرہ کالم ہیں اور ہر کالم میں اٹھارہ سطریں ہیں۔ اس طومار کی لمبائی 4.6 فٹ اور چوڑائی 5.1 انچ ہے۔ اس طومار میں عہد نامۂ قدیم کی عبارات تقریباً ساٹھ مقامات پر روایتی میسورائی متن سے مختلف ہیں۔

کتابِ حبقوق میں حبقوق نبی کی پیشین گوئیاں اسینیوں کے حالات و واقعات کے ساتھ بہت حد تک مماثلت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی بڑے اہتمام کے ساتھ تشریح و وضاحت کی گئی تھی۔ لہٰذا یہ تفسیر اسینی فرقے کی تاریخ کے

---

۱۳ Pesher دراصل اسینیوں کی پیش کردہ عہد نامہ قدیم کی تفسیر کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسینی علما عہد نامۂ قدیم کی تشریح خاص قسم کے نظریات کی روشنی میں کرتے تھے۔

۱۴ ***Interpreter's Dictionary of the Bible,*** Vol-1, pp. 796-797.

سلسلے میں ایک اہم دستاویز ہے۔

اسینیوں کا سماجی ضابطہ (The Mannual of Disciplne):(1QS)[۱۵]

یہ طومار 6.1 فٹ لمبا اور 9.4 انچ چوڑا ہے۔ اس میں گیارہ کالم ہیں اور ہر کالم میں چھبیس سطریں ہیں۔ اس طومار کا ابتدائی حصہ نہیں مل سکا۔ لہٰذا اس طومار کا عنوان نامعلوم ہے۔ غالباً اس کا عنوان *"Serekh Hayyahadh"* یعنی "Rule of Community" تھا۔ ڈاکٹر ملر بردز نے اس کا نام "Manual of Discipline" تجویز کیا ہے۔ اسینیوں میں اس دستاویز کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ قمران میں اس کے گیارہ مسودوں کے مختلف اجزا دستیاب ہوئے ہیں۔ ایف۔ ایم۔ کراس کے بقول ان میں سب سے قدیم دستاویز تقریباً پہلی صدی ق م کی ہے۔ اس کا رسم الخط بھی قدیم ہے۔ اس دستاویز میں درجِ ذیل امور کا تذکرہ موجود ہے:

۱۔ عہد نامہ کے قوانین اور عبادتی احکام۔

۲۔ اسینی معاشرے کے عقائد۔

۳۔ اس فرقے میں داخلے کی شرائط۔

۴۔ ضابطۂ تعزیرات (Penal code)۔

۵۔ عالم شر میں مقدس زندگی۔ (The Holy Life in the World of Evil)

۶۔ خدا کی حمد۔

اصل عبارت مندرجہ ذیل ہے:

> "The scroll prescribes: (a) the rules and liturgy of the covenant (1.1-3.12); (b) the doctrine of the community (3.13-4.26); (c) the admission (5.1-6.23); (d) the penal code (6.24-7.25); (e) theholy life in the world of evil (8.1-9.26); (f) the praise of God (10.1-11.22)."[۱۶]

ضابطۂ جنگ (The War Scroll (1QM)[۱۷]

موجودہ حالت میں یہ طومار 9.5 فٹ لمبا اور 6.2 انچ چوڑا ہے۔ اس طومار میں ساڑھے اٹھارہ کالم ہیں اور ہر کالم میں

---

۱۵ ***Interpreter's Dictionary of the Bible,*** Vol-1, pp. 796-797.

۱۶ Ibid., Vol-1, p. 797.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سولہ سے اٹھارہ سطریں ہیں۔ وادیِ قمران کے چوتھے غار سے اس طومار کی چار جزوی نقلیں دستیاب ہوئی ہیں۔

اس طومار میں فرزندانِ نور (Children of light) اور فرزندانِ ظلمت (Children of Darkness) کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ کا نقشہ کھنچا گیا ہے۔ فرزندانِ ظلمت شیطانی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ فرزندانِ نور حق کی نمائندہ قوت ہیں۔ اس ضابطہ کی رو سے اس آخری اور فیصلہ کن جنگ کا اختتام خدا کے حکم سے ہوگا۔ اس جنگ کا بیان عہد نامۂ قدیم میں موجود مبارک جنگ اور سیلوسیوں کے خلاف مکابیوں کی جدوجہد سے متعلقہ روایات سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس کے علاوہ کتاب حزقی ایل کے ابواب ۳۸، ۳۹ میں یاجوج اور ماجوج کے خلاف جدوجہد اور ہم عصر رومی پیش قدمیوں کے اثرات بھی اس ضابطہ میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اسینیوں کے مزامیر (1QH) The Hodayoth: The Praise of God [۱۸]

یہ طومار دو حصوں میں دستیاب ہوا۔ پہلا حصہ تین تہوں پر مشتمل تھا۔ ہر تہہ میں چار کالم تھے۔ دوسرا حصہ تقریباً بیس ٹکڑوں کی صورت میں تھا۔ اس طومار کی پرتیں (تہیں) بڑی خراب حالت میں ہیں۔ یہ تہیں غیر معمولی طور پر اونچی (چوڑی) ہیں۔ ہر تہ میں پینتیس سے اکتالیس سطریں ہیں۔ یہ طومار دو مختلف کاتبوں کا تحریر کردہ ہے۔ وادیِ قمران کے چوتھے غار سے چار مسودے ملے ہیں جن میں اس فرقے کی حمدیہ نظمیں (Hodayoth) درج ہیں۔ ان مسودوں کی بدولت 1QH میں چند نامعلوم مقامات کو پڑھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

(باقی)

---

۱۷ *Interpreter's Dictionary of the Bible,* Vol-1, pp. 798-799.

۱۸ *Interpreter's Dictionary of the Bible,* Vol-1, pp. 799-800.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد اسلم نجمی

جناب پرویز مشرف ـــــ حقائق یہ ہیں

۲۰ جون ۲۰۰۱ کو چیف ایگزیکٹو جناب پرویز مشرف نے صدرِ پاکستان کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ وہ افواجِ پاکستان کے سربراہ اور جائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔ گویا اب وہ چار مناصب کے بلاشرکتِ غیرے مالک ہیں۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا نادر واقعہ ہے کہ ایک شخص کی ذات میں چاروں عہدے جمع ہوئے ہوں۔

پرویز مشرف ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۱ کو نواز شریف کی ''عوامی حکومت'' کو گرا کر اپنے ہی جاری کردہ پی سی او کے تحت چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان سے پہلے پاکستان کے نظم سیاسی میں اس عہدے کا کوئی وجود نہ تھا، اور نہ آئین ہی میں اس کا کوئی ذکر ہے، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس منصب کے خالق اور ماورائے آئین اقدام کے نتیجے میں اس منصب پر فائز ہونے والے پہلے شخص ہیں، تو یہ غلط نہ ہوگا[۱]۔

صدرِ پاکستان کے عہدے کا حلف اٹھاتے وقت سیاسی، معاشی اور انتظامی حوالوں سے اس اقدام کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس پر مثبت اور منفی بہت سی باتوں کی گنجایش موجود ہے، مگر یہ ہماری بحث کا موضوع نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کے اقدام اور اب تک کے سیاسی حالات وواقعات کا اخلاقی اور دینی پس منظر میں جائزہ لینا ہے۔

یہ بات ابتدا ہی میں واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلام (ضابطۂ حیات نہیں) زاویۂ حیات ہے۔ اس کا اصل مسئلہ آخرت ہے۔ دنیوی معاملات کو اس نے انسانی عقل پر چھوڑ دیا ہے اور معلوم انسانی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے اس آخری ذریعۂ علم کو بالعموم صحیح طریقے سے استعمال کیا ہے، اور حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ البتہ حیاتِ انسانی کے جن گوشوں میں اس کے ٹھوکر کھانے کا امکان تھا، ان کے بارے میں کائنات کے خالق وفاطر نے وحی کے ذریعے سے اس کی رہنمائی کر دی ہے[۲]۔

۱؎ البتہ آئین میں وزیر اعظم کو چیف ایگزیکٹو کہا گیا ہے۔ یہ وزیر اعظم کے عوامی عہدے کی حیثیت کا بیان ہے، یہ الگ سے کسی نئے عہدے کا ذکر نہیں۔

۲؎ وحی اور عقل میں وہی رشتہ ہے جو انسان اور عقل میں ہے۔ جیسے انسان اگر عقل سے عاری ہو جائے تو پاگل قرار پاتا ہے، اسی طرح

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایسا واقع ہوا ہے کہ تمدن اور معاشرت اس کی ابدی ضرورت بن گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے دنیا میں ارادے کی آزادی اور اختیار حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ارادہ و اختیار اگر کسی قاعدے اور ضابطے کے پابند نہ رہیں اور بے لگام ہو جائیں تو اس سے معاشرتی اور تمدنی زندگی کے تہ و بالا ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس خطرے سے بچنے اور ارادہ و اختیار کو سوے استعمال سے بچانے کے لیے انسان نظمِ اجتماعی قائم کرتا، حکومت تشکیل دیتا اور مختلف معاشرتی ادارے بناتا ہے۔ وہ اس کے لیے اپنے ابنائے نوع میں سے اربابِ حل و عقد کے سامنے اپنے ارادہ و اختیار میں سے بہت کچھ سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو آئین و قانون کا پابند بنا لیتا ہے۔ یہ اس کے تمدن اور نظمِ اجتماعی کی ناگزیر ضرورت ہے۔

انسانی معاشرے میں نظمِ سیاسی کا قیام ابتدا ہی سے انسان کی فطری اور عمرانی ضرورت رہی ہے۔ اس لیے اس نظم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے چند ایسی چیزیں طے کر دی ہیں جن میں انسانی عقل کی رہنمائی ناگزیر تھی۔ نظمِ سیاسی کے کچھ امور متعین ہو چکے ہیں۔ ان طے شدہ امور کی خلاف ورزی کی صورت میں تمدن کی تباہی، تہذیب کی شکست و ریخت اور معاشرے کا انتشار و اختلال تاریخِ انسانی کے مشہود حقائق ہیں، جنھیں ثابت کرنے کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام کے نظمِ سیاسی میں اولوالامر (حکمرانوں) اور رعایا، دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ و رسول کے احکام کے پابند رہیں۔ اولوالامر کو ایسی کسی قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں ہے جو دین کے خلاف ہو۔ اسی طرح اگر اولوالامر قرآن و سنت کے پابند ہوں تو مسلمان ریاست کے شہریوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر صورت میں اپنے نظمِ سیاسی کے وفادار اور اُس سے وابستہ رہیں، حتیٰ کہ سیاسی خلفشار کی صورت میں بھی کسی مسلمان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ نظمِ اجتماعی کے خلاف کسی اقدام کی حمایت میں علمِ بغاوت بلند کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ناپسندیدگی، عصبیت اور کسی بھی طرح کے ذہنی تحفظ کے باوجود قانون سے فرار اختیار کرنے یا اس کی خلاف ورزی کرنے کے بجائے، ہر حال میں اس کے پابند رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اس وقت ہوگا، جب اولوالامر خود اللہ و رسول کی اطاعت میں زندگی گزاریں، فیصلے کریں اور قانون بنائیں۔ وہ اگر خدا اور رسول کی اطاعت سے نکل جاتے ہیں اور ان کے باغی بن کر اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں رعایا ان کی وفادار رہنے کی پابند نہیں ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر بھی مسلمانوں کی واضح اکثریت کی تائید و حمایت کے بغیر اربابِ حکومت کے خلاف خروج، بغاوت قرار پائے گا اور بغاوت اسلامی شریعت کی رو سے زمین پر فساد برپا کرنے کے مترادف ہے، جس کی سزا قرآن میں قتل بیان ہوئی ہے۔

اسی طرح دین میں حکمرانوں اور رعایا کی الگ الگ ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں۔

حکمرانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کو ہر سطح پر اس کی آخری صورت میں قائم کریں اور اسے عام آدمی کے لیے سہل الحصول بنائیں۔ عام آدمی کو اگر انصاف حاصل کرنے میں دقت پیش آئے یا کوئی رکاوٹ محسوس ہو تو حکومت کا

عقل اگر وحی کی روشنی سے محروم ہو جائے تو وہ بھی باؤلی ہو جاتی ہے۔

فرض ہے کہ وہ اس کی یہ مشکل حل کرے اور جو بھی رکاوٹ ہو، اسے دور کرے۔

اہلِ اقتدار کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل ہونے اور دنیا کی تنگ نائے سے نکل کر آخرت کی وسعتوں کی طرف سفر کرنے میں ان کی مدد کرے۔

دینی اعتبار سے حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی سطح پر لوگوں کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا پابند بنائیں۔ اور اپنے اسلام و ایمان کی شہادت کے طور پر مسجدوں میں عام مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کریں۔ بالخصوص نمازِ جمعہ میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے اور پھر انھیں نماز پڑھانے کا اہتمام اہلِ اقتدار ہی کی ذمہ داری ہے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے دوسرے محکموں کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شعبہ بھی قائم کریں۔

اسلامی ریاست کے مسلمان شہریوں کی بنیادی ذمہ داری نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے۔ وہ اگر یہ دو کام کر گزرتے ہیں تو انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے اسلامی ریاست کے شہریوں کو ملنے چاہییں۔

اس سلسلے کی ایک نہایت اہم چیز یہ ہے کہ اربابِ اقتدار اور ریاست کے شہریوں کا باہمی تعلق حاکم و محکوم کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم و محکوم کی تقسیم ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہے، ورنہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور قانونی لحاظ سے برابر ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ادائیگیِ زکوٰۃ کے بعد حکمران اپنی رعایا سے کوئی اور مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ ریاست کے شہری اگر یہ بنیادی مطالبات پورے کر دیں تو ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت حکمرانوں کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

اسلام کے نظمِ سیاسی کے بنیادی خط و خال واضح ہو جانے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا نظمِ حکومت کیسے تشکیل پائے گا؟ اس کے بارے میں قرآنِ مجید کی واضح ہدایت ہے کہ:

''اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔'' (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)

اس سے بالبداہت واضح ہے کہ مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی باہمی مشورے سے قائم ہوگا، باہمی مشورے سے باقی رہے گا اور (حالات اور ضرورت کے تحت) باہمی مشورے سے تبدیل ہوگا۔ اتفاق رائے نہ ہونے کی صورت میں اکثریت کی رائے قابلِ لحاظ ہوگی، اور اسی سے فیصلے کیے جائیں گے۔ حکمران یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ اجتماعی معاملات میں اپنے شہریوں کے اکثریتی فیصلے کو رد کر دیں۔ انھیں کاروبارِ حکومت چلانے اور لوگوں کے حقوق کے بارے میں فیصلے کرنے کے لیے عوام کی تائید حاصل ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اظہارِ رائے کی آزادی اور رائے کے احترام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حکمرانوں کی بے راہ روی، غلطی، خامی اور کوتاہی کی صورت میں عوام کو اُن پر تنقید کرنے اور (قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے) احتجاج کرنے کا حق حاصل ہو۔ حکمران اگر اس کے باوجود اپنی غلط روش نہ چھوڑیں، غلطیوں سے رجوع نہ کریں اور خامیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح نہ کریں تو رعایا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اتفاقِ رائے یا کثرتِ رائے سے ان سے حقِ حکمرانی چھین کر ملک کا اقتدار اپنے اعتماد کے دوسرے لوگوں کے حوالے کر دیں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام میں استبدادی حکومت کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اسلام مسلمانوں کے باہمی مشورے (رائے عامہ) سے قائم ہونے والی بدترین حکومت کو تو گوارا کر لیتا ہے، لیکن مسلمانوں کی رائے کو نظر انداز کر کے یا ان کی رائے کے خلاف قائم ہونے والی (استبدادی) حکومت کو اللہ و رسول کی ہدایات سے بغاوت قرار دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو برداشت کرنا تو کجا، اسلام رائے عامہ کے ذریعے سے قائم ہونے والی حکومت کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کو بے خبر رکھ کر اجتماعی معاملات چلائے۔ وہ اگر ایسا کرتی ہے تو یہ اسلام کے نزدیک صریح بددیانتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ اسلامی حکومت میں کثرتِ رائے سے ہونے والا فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے، مگر اس فیصلے کو غلط سمجھنے والوں کا اختلافِ رائے کا حق برقرار رہتا ہے۔ اختلاف کرنے والے اس بات کے تو پابند ہوں گے کہ نافذ العمل فیصلے کا احترام کریں اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تساہل، چشم پوشی اور غفلت سے کام نہ لیں، مگر وہ اس کے خلاف (قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے) اپنی رائے کا اظہار کرنے، اپنا استدلال پیش کرنے اور لوگوں کا ذہن (اور نقطۂ نظر) بدلنے کی کوشش کرنے میں آزاد ہوں گے۔ وہ نافذ العمل فیصلے کے اس وقت تک پابند رہیں گے، جب تک کہ وہ اکثریت کو اپنی رائے کا قائل کر کے فیصلے کی غلطی واضح نہ کر دیں اور (اتفاق رائے یا کثرتِ رائے سے) فیصلہ تبدیل کرانے کی پوزیشن میں آ جائیں۔

نظمِ سیاسی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا یہ وہ خلاصہ ہے جو قرآن و سنت، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ سے مستنبط ہوتا ہے۔ ہم جناب پرویز مشرف سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس کی روشنی میں غور فرمائیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟

ہر دور میں لوگوں کی رائے جاننے کا طریقہ معروف رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافِ راشدہ کے دور میں قبائلی نظام رائج تھا۔ لوگ اپنے لیڈروں اور قبائلی سرداروں کے ذریعے سے شریکِ مشورہ ہوتے تھے۔ آج کے دور میں بھی لوگوں کی رائے جاننے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ انھی میں سے ایک نظامِ جمہوریت ہے جس میں لوگ ووٹ کی پرچی کے ذریعے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عوام کی رائے حاصل کرنے کے اس طریقۂ کار سے اختلاف کرے، مگر اسے پھر اس کا متبادل کوئی ایسا طریقہ تجویز کرنا ہو گا جس میں عوام کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہو اور وہ بلا تکلف اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے کوئی شخص اگر مسلمانوں کے اقتدار پر قابض ہوتا ہے تو وہ غاصب ہے، اور اس کی حکومت استبدادی حکومت ہو گی۔ اسلامی شریعت میں ایسی حکومت کی کوئی گنجایش موجود نہیں ہے۔ ایسا کرنے والا آخرت میں اسلام کا باغی قرار پائے گا۔

رہی یہ بات کہ سیاست دانوں کی بداعمالیوں نے ملک کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا تھا، انھوں نے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر کے انھیں ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور اس سے تمام ادارے یا تو عملاً ختم ہو گئے تھے یا پھر تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے تھے، ایسی صورت میں نظریۂ ضرورت کے تحت سابقہ عوامی حکومت کو برطرف کر کے اقتدار سنبھالنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس استدلال میں بہت کچھ حقیقت موجود ہے اور اگر اس سارے استدلال کو تنقید کے بغیر

من وعن درست مان لیا جائے تو بھی کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

نظریۂ ضرورت اصلاً وہی عذر و اضطرار ہے جس کا ذکر قرآن میں کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت کے باب میں ہوا ہے۔ اس نظریے کی ضرورت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ مگر جو خرابیاں اس اضطرار کا باعث بنی تھیں اور جنھیں بنیاد بنا کر اقتدار پر قبضہ کیا گیا تھا، کیا وہ واقعی دور ہو گئی ہیں؟ یا انھیں دور کرنے کے لیے کیا کوئی واضح منصوبہ بندی کی گئی ہے؟ اگر حالات کا معروضی جائزہ لیا جائے تو جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ملک کا آئین معطل ہے۔

۲۔ ادارے آئینی تقاضا ہوتے ہیں اور آئینی سرپرستی میں اپنا وجود قائم رکھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ چونکہ آئین ہی نہیں ہے، اس لیے کسی ادارے کے وجود کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ ملکی تاریخ میں پہلی بار ایک شخص کی ذات میں اتنے اختیار (اور عہدے) جمع ہوئے ہیں۔

۴۔ عدالتیں پی سی او کے تحت کام کر رہی ہیں اور پی سی او چیف ایگزیکٹو ہی کا دوسرا نام ہے۔

۵۔ مہنگائی اور کرپشن اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہی ہے، لوگوں کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہو گیا ہے اور وہ حکومت سے مایوس ہو چکے ہیں۔

۶۔ جن سیاست دانوں کو کرپٹ قرار دے کر اقتدار چھینا گیا تھا، اب اُنھی کی مشاورت کو اپنی حکومت کے جواز کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

۷۔ نچلی سطح پر اختیارات کی منتقلی کے لیے جو نظام وضع کیا گیا ہے (اور جس کے چار مرحلے مکمل ہو چکے ہیں)، وہ غیر فطری، غیر عقلی، غیر اخلاقی اور غیر آئینی ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس نظام کی عمارت زمیں بوس ہو جائے گی، گویا اس نظام کو قائم کرنے میں ملک و قوم کا جو سرمایہ، وقت اور صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں، وہ سب رائیگاں جانے کا پورا خدشہ موجود ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں کچھ اور سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً:

۱۔ کیا نظریۂ ضرورت کو واقعی ملک و قوم کے مفاد میں استعمال کیا گیا ہے؟

۲۔ کیا ایسا کرتے وقت دینی، اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے؟

۳۔ برسر اقتدار آنے کے بعد اپنے سات نکاتی ایجنڈے میں پرویز مشرف صاحب نے قومی اعتماد اور معیشت کی بحالی کا جو وعدہ کیا تھا، کیا اس کا دور دور تک کوئی نشان ہے؟ اور کیا بحالی کا یہ سفر معکوس نہیں ہوا ہے؟

اگر ملت کا احترام، قوم کی صلاح و فلاح اور ملک کی بھلائی کا احساس زندہ ہو اور خدا کے حضور پیشی کا خوف موجود ہو تو بیان کردہ حقائق کی روشنی میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اختر حسین عزمی

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی

(۲)

مرض ووفات

ندوہ کے زمانے ہی میں انھیں وجع المفاصل کی شکایت پیدا ہوئی۔ کچھ عرصے بعد معدہ وجگر کی خرابی کا بھی شکار ہو گئے۔ اس کے بعد پاؤں میں سرطانی پھوڑا نمودار ہوا۔ جس پر عملِ جراحی کیا گیا، لیکن کامیاب ثابت نہ ہوا اور بالآخر یہ مردِ درویش اپنے عالمِ جوانی ہی میں ۶ مارچ ۱۹۲۶ کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔[۱۳]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیرت واخلاق

مولانا نگرامی کورانہ تقلید سے عاری، سچے متبع سنت اور عالمِ باعمل درویش منش انسان تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی جوان کے بچپن سے جواں سال وفات تک، پوری زندگی کے شاہد تھے، ان کی سیرت واخلاق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ فضل وکمال، تقریر وتحریر، مطالعہ ووسعتِ نظر تو الگ چیزیں ہیں، مرحوم کی زندگی کا اصل جوہر اس کے اخلاق تھے، سر تا پا انکسار، سرتاپا تواضع، حد درجہ فروتن، مگر اس کے ساتھ حد درجہ بے نیاز، عفی نفس، بلند حوصلہ، اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا حد درجہ لحاظ رکھنے والا، مطیع وفرماں بردار، مگر اس کے ساتھ خدا کے سوا ہر بڑائی سے نڈر اور ہر کبریائی سے بے خوف۔''

(یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۳)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''قید سے چھوٹے (شروع ۱۹۲۲ء) تو اپنے پرانے دارالعلوم ندوہ میں مدرس ہو کر آئے۔ استادوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ قد کے لحاظ سے بھی اور عمر کے لحاظ سے بھی۔ لیکن چند روز میں بڑے بھی انھیں اپنا بڑا ماننے لگے۔ علم وفضل، صلاح وتقویٰ، تواضع ومسکنت، ایثار ہر لحاظ سے مستحق بھی اسی کے تھے۔ ہر وقت خندہ رو رہتے۔ ہر ایک کی خدمت کر کے

۱۳؎ یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۳۔

خوش ہوتے۔ اپنے ندوی ہونے پر فخر کرتے اور اس سے زیادہ خود ندوہ ان پر فخر کرتا تھا۔ اتنا بے لوث، اتنا بے شر، دنیوی آلودگیوں سے اتنا بلند و برتر نمونۂ انسانیت کم ہی دیکھنے میں آیا۔... ندوہ میں شاید پچاس روپے مشاہرہ پا رہے تھے اور خاص حلقوں میں معروف و متعارف تھے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایک مانگ چار سو ماہوار کے مشاہرے کی آئی۔ چپکے سے انکار کر دیا اور پھر جیسے یہ کوئی قابلِ ذکر بھی نہیں۔ اس کا تذکرہ تک اپنے دوستوں رفیقوں سے نہ کیا۔''

(معاصرین، عبدالماجد دریابادی، ص ۲۲۴۔۲۲۵)

سید غلام بھیک نیرنگ معتمد جمعیت مرکزیہ تبلیغِ اسلام مولانا نگرامی کے کردار پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

''مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی ادیب، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، علم و فضل اور طہارت و تقویٰ کے علاوہ قوم و ملت کے مخلص خادم رہے اور بے ریا خاموش کارکن تھے۔ ان کے محاسن کا شمار مشکل ہے۔ جس بات کا ذکر یہاں خاص طور سے کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو تبلیغ سے خاص دلچسپی تھی۔ اور فنِ تبلیغ میں خاص بصیرت حاصل تھی۔ وہ جمعیتِ ہٰذا اور اس کی جماعتِ منتظمہ کے رکن تھے۔[۱۴]''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تلامذہ

مولانا نگرامی سے سیکڑوں طلبہ نے اکتسابِ فیض کیا۔ جن شاگردوں نے علمی دنیا میں نام پیدا کیا، ان میں سے چند اہم نام درجِ ذیل ہیں:

۱۔ سید ریاست علی ندوی	رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۲۔ شاہ معین الدین احمد ندوی	نگران دارالمصنفین و مدیر ''معارف''، اعظم گڑھ
۳۔ مولانا محمد حنیف ندوی	رفیق ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور
۴۔ مولانا عبدالباری المعروف ابوعلی اعظمی	معروف ادیب نقاد و شاعر[۱۵]
۵۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی	سابق مدیر ''معارف'' و نائب ناظم دارالمصنفین، اعظم گڑھ[۱۶]
۶۔ مولانا امین احسن اصلاحی	صاحبِ تفسیر ''تدبرِ قرآن''[۱۷]
۷۔ مولانا اختر احسن اصلاحی	سابق مہتمم مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڑھ[۱۸])

۱۴؎ جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی رپورٹ، یکم مارچ ۱۹۲۵ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵، ص ۲۵۔۲۶، سید غلام بھیک نیرنگ، نگرام مطبوعہ ۱۹۲۶۔

۱۵؎ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، پروفیسر اختر راہی، ص ۴۹۔ ماہنامہ ''المعارف'' لاہور اگست ۱۹۸۱۔

۱۶؎ پرانے چراغ، ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۸۷۔۲۹۷، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۸۱ء۔

۱۷؎ یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۱۔

۱۸؎ اشفاق احمد طویٰ، مولانا اختر احسن اصلاحی، مجلّہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، میر شخصیات نمبر شمارہ نمبر ۹، ۱۹۹۶ء۔ ص ۲۴۔

۸۔ مولانا نجم الدین اصلاحی | استاذ مدرستہ الاصلاح، صحافی و مصنف[19]

۹۔ مولانا عزیز الرحمٰن | سابق ایڈیٹر اخبار ''مشرق'' و ماہنامہ ''کونین''، گورکھپور[20]

۱۰۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی | سابق استاذ جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارک پور، استاذ التفسیر جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج[21]

تصنیفات و تالیفات

۱۔ نور الحق | مولانا ثناء اللہ امرتسری کی کتاب ''حق پرکاش'' کا حشو و زواید نکال کر عربی ترجمہ کیا۔

۲۔ لآلی الحکم | مجموعۂ احادیث

۳۔ خواتینِ اسلام | آیات و احادیث کی روشنی میں عورتوں کے فضائل اور حقوق و فرائض کے بیان پر مبسوط تحقیقی مقالہ۔

۴۔ درسِ آزادی | مجموعۂ سیاسی مضامین

۵۔ عدمِ تشدد کی فتح[22]

۶۔ ذکرِ مبارک | سیرتِ رسول

۷۔ عقائدِ اسلام | نوعمر طلبہ کے لیے[23]

۸۔ ''محمد'' | اسمِ محمد کی تشریح پر مشتمل رسالہ[24]

اس کے علاوہ بیسیوں مضامین ''پیغام''، کلکتہ، ''سچ''، لکھنؤ، ''الندوۃ''، لکھنؤ، ''معارف''، اعظم گڑھ اور دیگر جرائد میں شائع ہوئے۔

۱۹؎ محمد عارف اعظمی، مولانا نجم الدین، مجلّہ ایضاً، ص ۴۴۔ ۴۷۔

۲۰؎ عبدالماجد گونڈوی، مولانا عزیز الرحمٰن، ایضاً، ص ۸۲۔

۲۱؎ ہشام الدین نیپالی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مجلّہ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۲۲؎ یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۴۔

۲۳؎ پروفیسر اختر راہی ایضاً، ص ۴۹۔

۲۴؎ مطلوب الرحمٰن، ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ، خاص نمبر ۲ ۱۹۳۲ء، ص ۲۳۶۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

علمی مقام ومرتبہ مشاہیر کی نظر میں

مولانا نگرامی نے مولانا شبلی سے قرآنِ مجید پڑھا تھا اوران کے مطالعۂ قرآن سے بطورِ خاص متاثر تھے۔ بعدازاں مولانا حمیدالدین فراہی سے اکتسابِ فیض کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت وتربیت بھی انھیں حاصل رہی۔ اس طرح وہ وقت کے تین جید علما کے اسلوب سے فیض یافتہ تھے۔ اس کے علاوہ امام ابنِ تیمیہ کی تحریروں سے انھیں خاص دلچسپی تھی اور علامہ ابنِ قیم کی فکر کے گرویدہ تھے۔ ان چیزوں نے ان کے اندر قرآنی ادبیات کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اسی ذوق کے وسعتِ مطالعہ اور اپنی خداداد ذہانت کے سبب وہ نہایت مقبول استاد تھے۔ ان کے شاگرد مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دبلے پتلے چھوٹے سے قد میں بلا کی کشش تھی۔ گہری علمیت، بے مثال ذہانت، غیر معمولی وسعتِ نظر اور بلندیِ اخلاق کا عجیب وغریب مرقع تھے۔ مولانا شبلی کے فیضان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تربیت نے انھیں علم وخطابت کی جامعیت بخشی تھی جو مشکل ہی سے کہیں اور نظر آتی ہے۔ نگاہ ایسی کیمیا تھی کہ جس پر پڑ گئی، کندن بن گیا۔ ان کی بدولت طلبہ کی علمی اور ذہنی سطح بہت بلند ہوگئی تھی۔ اوران کے اندر غیر معمولی بیداری پیدا ہوگئی تھی۔''[۲۵]

سید سلیمان ندوی کی نظر میں اپنے اس شاگرد کا جو مقام تھا، اس بارے میں لکھتے ہیں:

''دارالعلوم ندوہ نے اپنی تیس برس کی مدت میں جتنے کارآمد اور علمِ دین کے خادم پیدا کیے، یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عبدالرحمٰن ان سب سے بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں علم وعمل کی ساری خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔''

(''یادِ رفتگاں''، سید سلیمان ندوی، ص ۶۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا نگرامی کی جواں مرگ پر جن الفاظ میں اپنے دکھ کا اظہار فرمایا ہے، وہ پتا دیتے ہیں کہ ان کی نظر میں مولانا کی کیا قدر ومنزلت تھی۔ لکھتے ہیں:

''ایک چراغ جلا لیکن قبل اس کے، اس کا اجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا۔ ایک آفتاب چمکا، لیکن پیشتر اس کے کہ اس کی شعاعیں پورا نور پھیلائیں، غروب ہو گیا۔ ایک پھول کھلا، مگر معاً مرجھا گیا۔ سبزہ لہلہایا مگر فوراً خشک ہو کر زمین کے برابر ہو گیا۔ حق کی پکار بلند ہوئی، لیکن معاً فضاے لامتناہی میں گم ہو گئی۔''

(وفیاتِ ماجدی، عبدالماجد دریابادی، ص ۵۴۔۵۵، لکھنؤ ۱۹۷۸ء)

مولانا امین احسن اصلاحی کو مولانا نگرامی کی صحبتِ فیض رساں سے اکتساب کا موقع حاصل رہا۔ وہ کہتے ہیں:

''مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بے حد ذہین اور ہمہ صفت موصوف استاد تھے۔ وہ بہت زبردست ادیب، شعلہ بیان خطیب اور ایک بے مثل شاعر تھے۔ فلسفہ اور علمِ کلام سے بھی آگاہ تھے۔ اپنی ان متنوع صلاحیتوں کی وجہ سے مدرسہ میں ''ہرفن مولا''

---

۲۵ عبدالسلام قدوائی ندوی، مقالہ: تاثرات اور یادیں، مشمولہ سید رئیس احمد جعفری ــــ شخصیت اور فن، کراچی ۱۹۷۰ء، ص ۱۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مشہور تھے۔'' (شہزاد سلیم، ''مولانا اصلاحی کی کہانی''، ماہنامہ اشراق، جنوری ۱۹۹۸۔ ص ۱۱۱)

مولانا نگرامی کی علمی قابلیت، سیاسی ذہانت اور صحافیانہ لیاقت کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ انھوں نے اپنی صرف ستائیس سالہ زندگی میں اتنا نام پیدا کیا کہ وقت کے معروف اہلِ علم ان کی شان میں رطب اللسان ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک خورشید جو غروب ہوا

بارہ ربیع الاوّل کو ہم نے ایک ایسے صاحبِ خیر کو سپردِ خاک کیا جو اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دیا دل میں فروزاں کیے جیتا رہا اور شاید زندگی کے آخری سالوں میں اس نے اسی دیے کی لو سے چراغِ حیات کو بھی روشن کیے رکھا۔ ورنہ سرطان جیسا مرض کہاں کسی کو جینے کی اتنی مہلت دیتا ہے۔ صاحب زادہ خورشید احمد گیلانی جب دنیا سے رخصت ہوئے تو ایک جواں سال کے آنگن میں اترنے والی اس مرگ پر صرف وہی لوگ افسردہ نہیں تھے جن کے ساتھ ان کا تعلق برسوں سے تھا، بلکہ مجھ جیسے ہزاروں ایسے بھی اشک بار تھے جنھوں نے ان کو کبھی پڑھا، سنا یا ایک دو مرتبہ ملے۔

یہ اتفاق ہے کہ میری ان سے پہلی ملاقات پچھلے سال انھی ربیع الاوّل کے دنوں میں ہوئی جب ہم دونوں لالہ موسیٰ میں ایک سیرت کانفرنس میں مدعو تھے۔ استاذِ گرامی جاوید احمد صاحب غامدی کے ساتھ چونکہ وہ محبت کا تعلق رکھتے تھے، اس لیے میری تحریریں بھی ان کی نظر سے گزرتی رہتی تھیں جو ''اشراق'' اور پھر ''جنگ'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ پہلی ملاقات میں، میری طالب علمانہ حیثیت کی انھوں نے جس طرح پزیرائی کی، حقیقت یہ ہے کہ گیلانی صاحب کی یہ ادا ان کی وسعتِ قلبی کی ایک دلیل بن کر میرے دل میں محفوظ ہوگئی۔ یہی نہیں، جب میں نے کانفرنس میں بعض ایسی باتیں کیں جو عوامی مذاق سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں تو انھوں نے میری اس گستاخی کی بھی برسرِ ممبر تحسین کی۔ پھر ایک مرتبہ کھوٹہ کے نواح میں عرس کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے وہ اسلام آباد آئے تو واپسی پر انھوں نے کئی گھنٹے میرے ساتھ گزارے۔ میری ان سے بس یہی دو ملاقاتیں ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر سنی تو دل پر ایک چرکا سا لگا۔ محسوس ہوا کہ جیسے ایک متاعِ عزیز سے محروم ہوگیا ہوں۔

ان کی اس خوبی سے تو بہت لوگ واقف ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گروہی اور فرقہ دارانہ تعصّبات سے بہت نالاں تھے۔ وہ خود بریلوی مسلک سے قریب تر تھے، لیکن جماعتِ اسلامی میں بھی رہے اور آخری سالوں میں تو اس کے لیے کوشاں ہوگئے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ مذہبی طبقات میں فاصلے کم ہوں اور وہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حل کے لیے یک سو ہوں۔ان کا ماہنامہ ''تسخیر'' جب تک شائع ہوتا رہا، اسی بات کا علم بردار رہا۔ان کا یہ سوزِ دروں اب بہت نمایاں تھا۔یہی وجہ ہے کہ لوگ مسلکی وابستگی سے ماورا ہو کر ان سے تعلقِ خاطر قائم کر لیتے تھے۔میں محسوس کر سکتا ہوں کہ ان کی وفات سے ان کے دلوں پر کیا گزری ہوگی۔ان کے جنازے کا ہجوم بتاتا ہے کہ لوگ مسلک میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن ان کے لیے دعاے مغفرت کے معاملے میں ہم آہنگ ہیں۔

ان کی ایک دوسری خوبی کی میرے دل میں بہت قدر ہے کہ وہ اپنی عزتِ نفس کے معاملے میں بہت حساس تھے۔اس کا تعلق ان کی ذات سے نہیں تھا، بلکہ ان سے تھا جو مذہبی تشخص کے ساتھ جیتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ معاشرے میں مذہب کے حوالے سے تعارف رکھتے ہیں، انھیں ہمیشہ ان لوگوں سے دور رہنا چاہیے جو اہلِ دنیا ہیں۔وہ اس بات کو بہت ناپسند کرتے تھے کہ مذہبی جماعتیں دنیا دار اہلِ سیاست سے اتحاد کر کے ان کے خدام کا کردار ادا کریں۔وہ مذہبی لوگوں کے سیاسی کردار کے حامی تھے، بلکہ ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ ان کا یہ کردار قائدانہ ہو۔میری جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس معاملے میں ان سے اختلاف کی جسارت کی کہ اہلِ مذہب کو عملی سیاست میں کوئی کردار ادا کرنا چاہیے۔میرا کہنا یہ تھا کہ اہلِ مذہب کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اہلِ سیاست کو متاثر کریں نہ کہ وہ سیاست کی حریفانہ کشمکش میں فریق بنیں، تاہم وہ اس بات کے قائل نہیں ہوئے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اہلِ سیاست میں یہ صلاحیت ہے نہ ذوق کہ وہ کسی مذہبی شخصیت سے کوئی تاثر قبول کریں۔ان کا استدلال یہ تھا کہ یہ لوگ جب اہلِ مذہب سے ملتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان سے استفادہ کریں یا ان کے افکار کی روشنی میں اپنے منشور اور اندازِ سیاست پر نظرِ ثانی کریں، بلکہ یہ حضرات صرف یہ سوچ لے کر آتے ہیں کہ وہ کس طرح مذہبی لوگوں کے اثر و رسوخ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ جب میں نے انھیں لاہور کے لیے اسلام آباد ایئر پورٹ پر الوداع کہا تو ہمارے درمیان یہی موضوع زیرِ بحث تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اہلِ مذہب میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اجتماعیت کا صحیح شعور رکھتے ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ سیاست کے مطالبات کیا ہیں؟ اور اگر مذہب کو یہاں معاشرتی تشکیل میں کوئی کردار ادا کرنا ہے تو اس کی ممکنہ صورت کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ صاحب زادہ خورشید احمد گیلانی انھی نایاب لوگوں میں سے تھے۔ان کے سیاسی تجزیے ''نوائے وقت'' میں باقاعدگی سے چھپتے رہے ہیں، ان کے مطالعے سے بھی ان کی اس صلاحیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔تحریر کے ساتھ ساتھ وہ تقریر کی دنیا میں بھی بہت موثر تھے۔وہ اپنی بات عام فہم طریقے پر کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔میں نے ایک دفعہ ہی اس کا مظاہرہ دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ وہ سامعین کی توجہ کو پوری طرح اپنی جانب مرتکز رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔پھر یہ کہ ان کی تقریریں محض لفاظی پر مبنی یا طلبِ داد کے لیے نہیں ہوتی تھیں، بلکہ ان میں عامۃ الناس کے لیے ایک مثبت پیغام ہوتا تھا۔لالہ موسیٰ کی سیرت کانفرنس میں، انھوں نے اپنی گفتگو اس نکتے پر مرتکز کیے رکھی کہ کس طرح اللہ کے آخری رسول محمد صلی

اللہ علیہ وسلم نے عام آدمی کی عزتِ نفس کو بحال کیا اور انسان کو انسان کی غلامی سے نکالا۔ وہ آج کے پاکستان کے بارے میں بھی یہی آرزو رکھتے تھے کہ یہاں بسنے والوں میں اپنی عزتِ نفس کا احساس پیدا ہو اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، اہلِ مذہب کا وقار انھیں بہت عزیز تھا۔ بلاشبہ یہ بھی بڑی سعادت ہے کہ ایک شخص دنیا سے اٹھے اور لوگ یہ خیال کریں کہ آج زمین پر خیر کم ہو گیا ہے۔ گیلانی صاحب کی وفات پر میرے جذبات کچھ ایسے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں اور اس معاملے میں اس لیے پر امید بھی ہوں کہ اس عالم کا پروردگار سب سے بڑھ کر غیرت والا ہے اور اسے وہ بندے پسند ہیں جو عزت رکھنے والے ہیں اور انسانوں کو لوگوں کے بجائے صرف اللہ کا بندہ بنانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد بلال

علامہ ابوالخیر اسدی کی رحلت

(۲)

مسلمانوں میں بدعقیدگی کا تعلق مجوسیت سے قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجوسیت کے نظریات اتنے عالمگیر ہیں کہ دنیا کا کوئی ایک مذہب بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اس کے ضرر سے بچ نکلا ہوا، امام اوزاعی تو اہلِ کتاب اور اسلام کے سوا دنیا کے باقی تمام مذاہب کو مجوسیت میں شمار کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے:

''اقوامِ عالم میں اسلام، یہودیت اور نصرانیت کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں وہ سب کے سب مجوسیت میں شامل ہیں۔'' (کتاب الاموال، ص ۵۴۵، حوالہ عرب و ہند عہدِ رسالت میں، ص ۱۴۸)

اور امام شہرستانی فرماتے ہیں:

''مجوسیت دینِ اکبر اور ملتِ عظمیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ سابقہ نبیوں میں سے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام مجوسیت کی عالم گیر امت کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اسی طرح دوسرا کوئی نبی بھی اتنی وسیع امت کے لیے مبعوث نہیں ہوا تھا۔'' (الملل والنحل، ج ۱، ص ۲۳۰)

اس کی وجہ یہ ہے کہ مجوسیت جس طرح اکثریت کی وجہ سے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، اس طرح اس مذہب کے نظریات بھی ایسے خطرناک تھے کہ اس کے لیے ایسے اولی العزم پیغمبر کی ضرورت تھی جو اس پوری ملت کے مہلک نظریات کی اصلاح کر سکے۔ جس عہد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، اس وقت بابلی اور عرب کی مجوسیت صائبہ کے نام سے مشہور تھی، یعنی ہر خطے میں مجوسیت مختلف ناموں کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔

اصولاً سب کے سب آگ اور کواکب کی پرستش کرتے تھے اور انھیں اپنے اوتاروں اور روحانیات کا مظہر سمجھتے تھے۔ عہدِ ابراہیم کی مجوسیت کے اہم نظریات میں سے ایک یہ نظریہ بھی تھا کہ وہ نبوت کے لیے بشری عوارض کی وجہ سے انسان کو نبی نہ مانتے تھے۔

علامہ شہرستانی لکھتے ہیں:

''صائبہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک بھی ہے اور کثیر بھی۔ وہ ذات کے لحاظ سے تو واحد ہے اور دیکھنے والے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی نگاہ میں جو مختلف صورتیں نظر آ رہی ہیں، اس وجہ سے وہ کثیر ہے۔ جیسے آسمان پر تدبر کرنے والے سات ستارے علیحدہ علیحدہ صورتوں میں نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان ستاروں کے ذریعے اپنے افعال کو ظاہر کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان کی صورتوں میں متشخص کر لیتا ہے۔ اس طرح جو اس کی ذاتی وحدت ہے یہ کثرت اسے باطل نہیں کر سکتی اور بعض دفعہ صائبہ اپنے اس عقیدہ کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ جتنے ہیاکلِ سماوی موجود ہیں ان کی ہر صورت میں خدا اپنے آپ کو متشخص کیے ہوئے ہے، حالانکہ وہ ذات کے لحاظ سے واحد ہے لیکن ان تشخصات کی وجہ سے کثیر ہے۔ ان ہیاکل میں ظاہر ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہر ستارے کی استعداد اور اس کے تشخص کے مطابق خدا اپنے کسی نہ کسی فعل کو ان کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ گویا ان سات ہیاکل کو سات اعضا کے مانند تصور کریں جن کے ذریعے اس کی صفات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح ہمارے سات اعضا بھی گویا اس خدا کے سات ہیاکل ہیں وہ ہمارے ان اعضا کے ذریعے سے اپنے افعال کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ پس وہ ہماری زبان کے ساتھ بولتا ہے، ہماری آنکھوں کے ساتھ دیکھتا ہے، ہمارے کانوں کے ساتھ سنتا ہے، ہمارے ہاتھوں کے ساتھ تنگی اور فراخی کرتا ہے اور ہمارے پاؤں کے ساتھ آتا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ہمارے اندر جتنے جوارح موجود ہیں ان کے ذریعے سے خدا اپنے افعال کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ (الملل والنحل۔ ج ۲، ص ۵۴۔ ۵۶)''

اس کے بعد ابوالخیر اپنے نقطۂ نظر کا استدلال واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جن کمالات کا ذکر قرآن و حدیث میں مذکور ہے وہ سب کمالات شہادت دے رہے ہیں کہ آپ کے عنصری وجود پر تمام پیغمبرانہ خصائص کی انتہا اور نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ اب دنیا کسی نئے آنے والے نبی کے وجود سے بالکل مستغنی ہو گئی ہے۔ لسان العرب، صحاح جوہری، قاموس کے تمام ائمۂ لغت نے لفظ ''ختم'' کے لغوی معنی یہ بیان کیے ہیں کہ کس چیز کو اس طرح بند کرنا کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اندر جا سکے۔ اسی سے اس کے دوسرے معنی کسی شے کو بند کر کے اس پر مہر کرنا بھی کرتے ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے۔

لفظ خاتم کی دو قرأتیں ہیں۔ مفسر ابن جریر اور ابن حبان اندلسی لکھتے ہیں کہ خاتم کی مشہور قرأت تا کے زیر کے ساتھ ہے جس کا معنی ختم کرنے والا ہے۔ اور دوسری قرأت خاتم کے زبر کے ساتھ ہے جس کا معنی ہے، وہ شے جس کے ذریعے سے کسی چیز کو بند کر دیا جائے اور اس پر مہر لگا دی جائے تاکہ اسے کوئی کھول نہ سکے۔ اور نہ اس کے اندر کی چیز باہر جا سکے۔ الغرض دونوں حالتوں میں آیت پاک کا حاصلِ معنی ایک ہی ہوگا کہ آپ کا عنصری وجود پیغمبروں کے سلسلے کو بند کرنے والا اور ان پر مہر لگا دینے والا ہے تاکہ آیندہ کوئی نیا شخص پیغمبروں کی مقدس جماعت میں داخل نہ ہو سکے۔ اس کی تشریح احادیث میں اس طرح ہے:

''میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بلکہ خلفا آتے رہیں گے۔''

(بخاری، ج ۱، ص ۴۹۱۔ مسلم، ج ۲، ص ۴۹۱)

محدث ابنِ حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے آپ کے عنصری وجود کے بعد نبیوں کے طویل سلسلے کو بند کر دیا ہے اور آپ پر شریعت کی بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تکمیل کر دی گئی ہے۔'' (فتح الباری بحوالہ حاشیہ بخاری، ج۱، ص۵۰۱)

ترمذی میں ہے:

''رسالت اور نبوت کا سلسلہ بالکل منقطع ہو چکا ہے۔ میرے بعد اب نہ کوئی نیا نبی آ سکتا ہے اور نہ کوئی رسول۔''

(ترمذی ج۲، ص۱۲۹)

محدث ابن التین فرماتے ہیں:

''اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وحی کا سلسلہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو چکا ہے۔''

(حاشیہ بخاری، ج۲، ص۱۰۳۵)

قرآن اور احادیث میں جو خاتم النبیین کی تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی موت کے بعد جو آپ کے عنصری وجود پر طاری ہوئی تھی، اس موت کے بعد نہ کوئی نیا نبی آ سکتا ہے اور نہ اس موت کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے۔ یعنی ذاتِ نبویہ کی موت کے وقت سے لے کر تا قیامت ہر قسم کی نبوت کا باب بند کر دیا گیا ہے۔ اسے زمانی ختمِ نبوت کہتے ہیں اور اسی عقیدہ پر جمہورِ امت کا اتفاق ہے لیکن جناب نانوتوی صاحب نے اس کا خلاف کرتے ہوئے ختمِ نبوت کا ایک دوسرا مفہوم اختراع کیا ہے جس کا نام ہے ''مرتبی ختمِ نبوت''۔ اس کا آسان مفہوم یہ ہے کہ کائنات سے قبل خدا نے آپ کا نور پیدا کر کے اس میں نبوت کے سارے مادے کو جمع کر دیا تھا جب تک حضرت آدم پیدا نہ ہوئے تھے آپ کی یہ روحانی نبوت سارے نبیوں کی ارواح کی مربی تھی۔ جب حضرت آدم پیدا ہو گئے تو آپ کی مرکزی نبوت سے فیض حاصل کر کے اپنے عہد میں تبلیغ کرتے رہے۔ اس کے بعد سلسلہ وار ہر نبی اپنے اپنے عہد میں آپ کی نبوت سے فیض لے کر بطور سفیر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد جب آپ اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا میری موت کے بعد اب نیا نبی نہیں آئے گا اس لیے نبوت کا مکمل طور پر انقطاع ہو چکا ہے لیکن نانوتوی اور اس کے ہم خیال علما کے نزدیک مرتبی نبوت کے بعد چونکہ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک نبی آتے رہے تھے لہٰذا نانوتوی صاحب لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد مرتبی نبوت کے تحت بالفرض اگر کوئی نیا نبی آ جائے تو آپ کی مرتبی ختم نبوت میں فرق نہیں آئے گا۔ لیکن زمانی ختم نبوت کے تحت ''لا نبی بعدی'' کے قانون میں فرق آ جائے گا۔ نانوتوی کا یہ نظریہ ابنِ عربی کی حقیقت محمدیہ سے ماخوذ ہے۔ ابنِ عربی کہتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد تشریعی نبی نہیں آ سکتا لیکن غیر تشریعی نبی آتے رہیں گے۔ ابنِ عربی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''ذاتِ نبویہ کے بعد مطلق نبوت مرتفع نہیں ہوئی بلکہ تشریعی نبوت کا ارتفاع ہو چکا ہے۔''

(الیواقیت والجواہر، ج۲، ص۲۴)

ابنِ عربی کے ان الفاظ پر آپ تدبر کے ساتھ غور کریں کہ اس کے نزدیک نبوت کی کیا تعریف ہے۔ یعنی نبوت اپنے اطلاق کی وجہ سے اتنا وسیع مقام رکھتی ہے کہ آپ کی وفات صرف تشریعی نبوت کو تو ختم کر سکتی ہے، لیکن آپ کی وفات سے مطلق نبوت کی وسعت ختم نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے غیر تشریعی نبوت کا اجرا ہوتا رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابنِ عربی

کے نزدیک ذاتِ نبویہ کی جامع نبوت پر نبوت کا وسیع اطلاق عائد نہیں ہو سکتا بلکہ وہ مطلق نبوت کا ایک مخصوص حصہ ہے۔ یہ مخصوص حصہ صرف تشریعی نبوت کو تو بند کر سکتا ہے لیکن غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو بند نہیں کر سکتا۔

(مقامِ نبوت کی عجمی تعبیر، ص ۳۷۔ ۳۸، ۲۴۷۔ ۲۵۱)''

او پر مذکورہ اقتباسات سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ابوالخیر گردوپیش سے بے نیاز صرف گہری نظریاتی تحقیقات ہی میں ڈوبے رہتے تھے، بلکہ وہ معاشرے پر بالخصوص مذہبی دنیا پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مقام پر ''اہلِ علم کی موجودہ روش پر چند آنسو'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ہمارے دور میں دینی مدرسوں میں جو عربی نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ اتنا کمزور ہے کہ ان سے فارغ شدہ علما لکھے ہوئے ترجمہ کے بغیر قرآن کی ایک آیت کا بھی صحیح ترجمہ نہیں کر سکتے۔ علامہ تفتازانی کی شرح عقائد علمِ کلام کی اعلیٰ ترین کتاب ہے۔ یہ کتاب چونکہ عویق انداز میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس کے فلسفیانہ دلائل کو طلبا کے سقیم اذہان اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے پس امتحان میں انھیں چند اعزازی نمبر دے کر پاس کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ علمِ کلام میں کمزور ہوتے ہیں۔ قرآن کی تفہیم کے لیے سورۂ بقرہ کے چند رکوع تبرکاً بیضاوی وغیرہ سے پڑھا دیے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں احناف کی اکثریت ہے۔ ان کے مقابلے میں اہلِ حدیث کے مدرسے ہیں۔ دونوں حضرات اپنے اپنے مدرسوں میں مشکوٰۃ اور صحاحِ ستہ کا دورہ کرواتے ہیں۔ چونکہ ان دونوں حضرات کے درمیان تقلید، سورۂ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر وغیرہ میں اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے وہ حدیث کے اس سارے نصاب میں ان ہی مسائل کی تردید اور تائید پر زور لگاتے رہتے ہیں۔ فارغ ہونے کے بعد جن کے گلے میں کچھ مٹھاس ہوتی ہے، وہ واعظ بن جاتے ہیں۔ اگر تقریر میں کچھ شاطرانہ روش رکھتے بھی ہوں تو مناظر بن جاتے ہیں۔ اگر کچھ ذہنی ذکاوت رکھتے ہوں تو تدریس کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر وہ کسی خاص قابلیت کے حامل نہ ہوں تو حاجی بوٹا کی مسجد میں امام بن جاتے ہیں۔ دین کے ان تمام شعبوں میں معاشی ضروریات کو زیادہ مقدم رکھا جاتا ہے۔ چونکہ علما کی معاشی ضروریات کو عوامی چندوں کے ذریعے سے پورا کیا جاتا ہے اس لیے چندے کی وصولی میں حرام وحلال کا امتیاز بالکل ختم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ چندوں میں بینک کی سودی رقم بھی وصول کر لیتے ہیں۔ اہلِ علم جب ایسے حرام مال کو استعمال کرتے ہیں تو اس کی تاثیر سے ان کے علم و اخلاق میں تقویٰ کا نور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ جب دین کے معاملے میں ایسے حالات جمع ہو جائیں تو ان میں رازی، غزالی، تفتازانی، زمخشری اور جرجانی جیسے ذی علم کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر اس کا نتیجہ یہی تو نکلے گا: بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے مجازی کلام کو معارفِ الٰہیہ کا اعلیٰ مقام سمجھا جائے گا۔'' (فلسفۂ توحید کی عجمی تشکیل، ص ۷۴۔ ۷۵)

علامہ ابوالخیر اسدی علمائے دین کی ان تمام خامیوں سے پاک و صاف تھے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابوالخیر کی وفات سے دین و دانش کی دنیا میں کتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مگر کوئی عالم ہو یا عامی، اسے ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہی ہے۔ اُمید ہے کہ ان کے جانشیں ان کی قائم کی گئی روایات کو زندہ رکھیں گے۔

ہم اس شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ:

اب اس کے سوگ میں کچھ اور کیا کہیں ہم لوگ
کہ مرنے والا تو ہم سے زیادہ زندہ تھا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

——— جاوید

O

وہی ہے دہر میں اپنے مقام سے آگاہ		ہوا جو لذتِ ذکر دوام سے آگاہ

یہ تیرا علم و محبت ، یہ معرفت ، یہ خیال		ہوئے نہ آہ ،خدا کے کلام سے آگاہ

سمجھ ہی لے گی شریعت کا مدعا بھی خرد		اگر ہے اپنے حلال و حرام سے آگاہ

ترے جہاں میں غریبوں کی زندگی کیا ہے!		نہ اپنی صبح سے واقف ، نہ شام سے آگاہ

وفورِ شوق میں کہہ دی ہے سرگزشت اپنی
وگرنہ آپ ہیں اپنے غلام سے آگاہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org